ماہنامہ

اشراق

لاہور

جولائی ۲۰۲۵ء

1979
سے جاری شدہ
اشاعت کے
46 سال

زیرسرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

”بندۂ مومن ... کا قلب خدا کی یاد سے معمور ہے تو اس کی زبان بھی اس کے ذکر سے تر رہتی ہے۔ وہ نعمتیں پاتا ہے تو شکر کے کلمات اس کی زبان پر آجاتے ہیں۔ کوئی تنگی ترشی پیش آتی ہے تو اللہ سے نجات کا طالب بن جاتا ہے اور اپنا احتساب کرنے لگتا ہے کہ اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کا تدارک کرے، نیکیوں میں سرگرمی دکھائے کہ اللہ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہو۔“ —— شذرات

- جب وہ (اللہ) خالق ہے تو وہی مالک بھی ہے۔ اُس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد اُن کے خزانوں کی کنجیاں کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دے دی ہیں۔ وہ اُسی کے پاس ہیں۔ اِس لیے عنایت و رحمت کی تمام امیدیں بھی اُسی سے رکھنی چاہییں۔ کسی دوسرے کے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ اُس سے کوئی امید رکھی جائے۔ (قرآنیات)
- بندۂ مومن چونکہ اللہ کی بندگی میں جی رہا ہوتا ہے، اس لیے اس سے گناہ تو ہو سکتا ہے، لیکن وہ فاسق و فاجر نہیں ہوتا کہ گناہ پر ہی قائم رہے۔ خدا کی یاد اسے چونکا دیتی ہے اور وہ اپنے گناہ پر نادم ہوتا اور اللہ سے معافی مانگنے لگ جاتا ہے، اس لیے کہ اللہ کی گرفت سے کوئی اور بچانے والا نہیں ہے۔ (شذرات)
- قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا پہلا گناہ شراب، زنا اور خنزیر جیسی چیزیں نہیں، بلکہ کائنات کا پہلا گناہ کبر و انانیت تھا، یعنی اِس زعم کا احساس کہ میں دوسرے شخص کے مقابلے میں زیادہ بہتر حیثیت رکھتا ہوں: ’اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ‘ (الاعراف ۷: ۱۲)۔ (اصلاح و دعوت)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیرسرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۷ شمارہ ۷ جولائی ۲۰۲۵ء محرم الحرام ۱۴۴۷ھ

فہرست

شذرات		
ذکرِ دوام	طالب محسن	۴
قرآنیات		
البیان: الشوریٰ ۴۲: ۱۱-۲۰ (۲)	جاوید احمد غامدی	۸
معارف نبوی		
شقِ قمر کا واقعہ	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۱۵
مقالات		
اسلام اور تاریخیت؟	ڈاکٹر ساجد حمید	۲۵
سیر و سوانح		
السابقون الاولون من الانصار (۶)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۵
نقطۂ نظر		
تفسیر ''مفتاح القرآن'' کا ایک علمی مطالعہ (۴)	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۴۶
اہل کتاب خواتین سے نکاح: جواز و عدم جواز کی بحث	وارث مظہری	۵۷
اصلاح و دعوت		
کائنات کا پہلا گناہ	محمد ذکوان ندوی	۶۴
شخصیات		
حیات امین احسن (۲۲)	محمد بلال	۶۹

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد
محمد رفیع مفتی
طالب محسن
محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن
ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم
آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر
خورشید احمد ندیم
اظہار احمد
کوکب شہزاد
جنید حسن
مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا
نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

شذرات

طالب محسن

ذکرِ دوام

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور بندیوں کی ایک صفت 'ذاکرین' اور 'ذاکرات' بیان کی ہے:

وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا. (الاحزاب ۳۳: ۳۵)

''اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں، ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

اس آیت میں اہل ایمان کی یہ صفت ان صفات کے آخر میں بیان ہوئی ہے جو صفات کامل بندگی کے تمام احوال کو محیط ہیں۔ قرآن مجید میں ذکر کثیر جس طرح اہل ایمان کے وصف کی حیثیت سے بیان ہوتا ہے، اسی طرح کئی مقامات پر اس کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا. وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا. (الاحزاب ۳۳: ۴۱-۴۲)

''اے ایمان والو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔''

بندۂ مومن کے مطلوب حال کے طور پر اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس کا اندازہ اس حکم سے ہوتا ہے جو حضرات ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا:

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ. (طٰہٰ ۲۰: ۴۲)

''تم اور تمھارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرنا۔''

اسی طرح حضرت ذکریا علیہ السلام کو بھی اسی کی تلقین کی:

قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِیۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡكَارِ. (آل عمران ۳:۴۱)

”درخواست کی: میرے رب، میرے لیے کوئی نشانی ٹھیرا دیجیے۔ ارشاد ہوا: تیری نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن تک اشارے کے سوا بات نہ کر سکے گا۔ اپنے رب کو بہت یاد کر اور صبح و شام تسبیح کر۔“

ذکر کیا ہے؟ قرآن مجید نے اسے مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے اور اس کے ظاہری اور باطنی احوال کی توضیح کی ہے۔ جب کوئی آدمی یہ یقین پیدا کر لیتا ہے کہ اس کا ایک خالق و مالک ہے، وہی اکیلا اس کے معاملات کو دیکھ اور چلا رہا ہے اور اسے ایک روز اس کے حضور اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے کے لیے پیش ہونا ہے تو اس کی شخصیت میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ اس کی اصل فکر اپنے رب کی رضا کا حصول بن جاتی ہے۔ وہ رب کی خشیت سے لبریز دل سے اس کے سہارے کا طالب بن جاتا ہے۔ وہ اس کی قدرت، طاقت اور عظمت کے یقین پر اسی پر متوکل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے انعام کو پانے کے لیے گناہوں سے مجتنب اور نیکیوں میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ توبہ و انابت، خشوع و خضوع، ذکر و فکر، تفویض و توکل، راضی بر رضا ہونا اور امتثال امر اس کا ظاہر و باطن بن جاتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا مظہر خدا کی یاد ہے۔ ایک حکیم و قدیر خدا کی یاد:

اَلَّذِیۡنَ یَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَكَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (آل عمران ۳:۱۹۱)

”وہ جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق پر غور کرتے ہیں تو (کہہ اٹھتے ہیں): اے ہمارے رب، تو نے اسے بے مقصد نہیں بنایا۔ تو اس سے پاک ہے۔ ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔“

خدا کے یہ بندے جب غفلت اور جذبات کا شکار ہو کر گناہ کر بیٹھتے ہیں تو خدا کی یاد آتے ہی اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگ جاتے ہیں اور ان کا طرز زندگی گناہ پر اصرار نہیں ہوتا:

وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۖ وَمَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا

”اور یہ لوگ جب بے حیائی کا کوئی کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر کوئی ظلم کرتے ہیں، انھیں اللہ یاد آیا تو انھوں نے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔

اللّٰهُ ۪ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ.(آل عمران ۳: ۱۳۵)

اللہ کے سوا معاف کرنے والا کون ہے۔انھوں نے جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کیا۔“

بندۂ مومن چونکہ اللہ کی بندگی میں جی رہا ہوتا ہے، اس لیے اس سے گناہ تو ہو سکتا ہے، لیکن وہ فاسق و فاجر نہیں ہوتا کہ گناہ پر ہی قائم رہے۔ خدا کی یاد اسے چونکا دیتی ہے اور وہ اپنے گناہ پر نادم ہوتا اور اللہ سے معافی مانگنے لگ جاتا ہے، اس لیے کہ اللہ کی گرفت سے کوئی اور بچانے والا نہیں ہے۔ یہ آیت یاد الٰہی کے ایک حال اور اس کی برکت کا بیان ہے۔

جب خدا کی یاد دلائی جاتی ہے تو بندۂ مؤمن لرزہ براندام ہو جاتا ہے:

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (الحج ۲۲: ۳۵)

”ان کا حال یہ ہے کہ جب انھیں اللہ یاد دلایا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ جو بھی مشکلات و مصائب پیش آئیں، ثابت قدم رہتے ہیں۔ نماز کے پابند اور ہمارے عطا کردہ رزق میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔“

قرآن مجید کے ان چند مقامات کا حوالہ یہ واضح کر دیتا ہے کہ بندۂ مومن کس طرح اللہ کے ساتھ شعوری طور پر متعلق رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا قلب خدا کی یاد سے معمور ہے تو اس کی زبان بھی اس کے ذکر سے تر رہتی ہے۔ وہ نعمتیں پاتا ہے تو شکر کے کلمات اس کی زبان پر آجاتے ہیں۔ کوئی تنگی ترشی پیش آتی ہے تو اللہ سے نجات کا طالب بن جاتا ہے اور اپنا احتساب کرنے لگتا ہے کہ اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کا تدارک کرے، نیکیوں میں سرگرمی دکھائے کہ اللہ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہو۔ کوئی ارادہ کرتا ہے تو ’ان شاء اللہ‘ کہہ کر اللہ کے ارادے کے ہر ارادے پر فائق ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ کسی کو کسی نعمت کے حال میں دیکھتا ہے تو ’ماشاء اللہ‘ کہہ کر اللہ کے فیصلے کو دل کی آمادگی سے ماننے کا اقرار کرتا ہے۔ کوئی کام شروع کرتا ہے تو اللہ کے نام سے کرتا ہے کہ اس کا فضل و عنایت شامل حال ہو۔ جب کسی اندیشے یا وسوسے کا شکار ہوتا ہے تو اللہ کی پناہ مانگتا ہے۔ سواری پر سوار ہو، بستر پر سونے لگے، صبح کرے یا شام کرے، گھر میں داخل ہو یا گھر سے نکلے، خرید و فروخت کرنے لگے، غرض زندگی کے ہر معاملے میں اس کی زبان پر حمد و تسبیح، دعا و مناجات، ایمان و یقین اور استمداد و استعانت کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول دعائیں انھی مضامین کا مرقع ہیں۔ ان میں

خدا کی معرفت اور بندگی کا حال اپنی پوری شان سے سمویا ہوا ہے۔ ان دعاؤں کی اصل شان یہی ہے کہ یہ ذکر دائم اور تفویض و توکل کے اظہار کی ایک پاکیزہ صورت ہیں۔

یہ جو قرآن نے بیان کیا ہے کہ اللہ کے بندے ذاکر ہوتے ہیں اور اللہ کی بندیاں ذاکرات ہوتی ہیں، ان سطور میں اسی وصف کی توضیح کی گئی ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ کلمات ذکر و تسبیح کا زبان پر جاری ہونا اپنی حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الشوریٰ

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا
وَّمِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡہِ ؕ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ وَھُوَ
السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱۱﴾ لَہٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ

وہی زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اُسی نے تمھاری جنس سے تمھارے لیے جوڑے بنائے اور چوپایوں کی جنس سے بھی جوڑے بنائے۔ وہ اِس مزرعہ میں تمھاری تخم ریزی کرتا ہے۔[۸۶] اُس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے[۸۷] اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔[۸۸] زمین اور آسمانوں کی کنجیاں

۸۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡہِ'۔ اِن میں ضمیر مجرور کا مرجع اُس مفہوم کے اندر ہے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے، یعنی انسانوں اور جانوروں کے اندر پیدایش کا وہ نظام جو گویا ایک فارم یا مزرعہ ہے جس سے وہ اگتے رہتے ہیں۔ عربی زبان میں ضمیریں اِس طریقے سے آتی ہیں۔

۸۷۔ یہ پچھلی بات کا نتیجہ ہے کہ جس نے یہ عظیم چیزیں پیدا کیں اور تخلیق کا یہ حیرت انگیز نظام قائم کیا

يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٢﴾
شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ

اُسی کے پاس ہیں۔[۸۹] وہ جس کی روزی چاہتا ہے، کشادہ کرتا ہے اور جس کی چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔بے شک، وہ ہر چیز سے واقف ہے۔۱۱-۱۲

اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اُس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی، (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا[۹۰] کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم رکھو[۹۱] اور اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔[۹۲] تم جس چیز کی

ہے، اُس کے مثل کوئی چیز آخر کیسے ہو سکتی ہے؟ یقیناً کوئی چیز بھی اُس کے مثل نہیں ہے۔

۸۸۔ یعنی حقیقی سننے والا اور دیکھنے والا وہی ہے، اِس لیے کہ ایک سمیع و بصیر خالق ہی ایسی وسیع کائنات کو وجود میں لا سکتا ہے اور وہی اُسے قائم رکھ سکتا ہے۔

۸۹۔ یعنی جب وہ خالق ہے تو وہی مالک بھی ہے۔ اُس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد اُن کے خزانوں کی کنجیاں کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دے دی ہیں۔ وہ اُسی کے پاس ہیں۔ اِس لیے عنایت و رحمت کی تمام امیدیں بھی اُسی سے رکھنی چاہییں۔ کسی دوسرے کے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ اُس سے کوئی امید رکھی جائے۔

۹۰۔ یہ اب اُسی مضمون کی تفصیل فرمائی ہے جو سورہ کی ابتدا میں بیان ہوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا دین لے کر نہیں آئے ہیں جو اہل عرب کے لیے انوکھا اور اجنبی ہو، بلکہ اُسی دین کی دعوت دے رہے ہیں جس کی دعوت اُن سے پہلے کے پیغمبر دیتے رہے ہیں۔ اُس کے عقائد وہی ہیں، اُس کی اساسات وہی ہیں، اُس کی اخلاقی تعلیمات وہی ہیں اور چند ترامیم اور اضافوں کے سوا اُس کی شریعت بھی بالکل وہی ہے۔ اِس کے لیے انبیا علیہم السلام کا حوالہ جس طریقے سے دیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... پہلے ابتدائی اور آخری کڑی، یعنی حضرت نوح اور حضرت خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر بیچ کے انبیا میں سے تین جلیل القدر نبیوں —— حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام —— کا نام، خاص طور پر لیا۔ اِس اہتمام خاص کے ساتھ اِن کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ اِنھی تینوں نبیوں کی پیروی کے مدعی اُس وقت قرآن کے سامنے تھے۔ مشرکین عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے مدعی تھے اور یہود و نصاریٰ بالترتیب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ اِس طرح گویا نبیوں کی پوری تاریخ کی طرف بھی اجمالی اشارہ ہو گیا اور قابل ذکر امتیں بھی سامنے آ گئیں۔“

(تدبر قرآن ۷/ ۱۵۲)

۹۱۔ یعنی اِس کو برقرار رکھو اور اِس پر قائم رہو۔ اِس کا کوئی حکم اگر فرد سے متعلق ہے تو فرد اُس پر قائم رہے اور معاشرے سے متعلق ہے تو معاشرے کے ارباب حل و عقد اُس پر قائم رہیں اور اُس کو پوری طرح برقرار رکھیں۔ اقامت دین کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ جن اہل علم نے اِسے دین کو دنیا میں جاری اور نافذ کرنے یا رکھنے کے معنی میں لیا ہے، اُن کی راے عربیت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم نے ”تاویل کی غلطی“ کے زیر عنوان اپنی کتاب ”برہان“ میں اِس راے کی غلطی واضح کر دی ہے۔ یہ بالکل اُسی طرح کی تعبیر ہے، جیسے اقامت صلوٰۃ ہے۔ جس طرح اُس کے معنی نماز کو دنیا میں جاری اور نافذ کرنے کے نہیں ہیں، اُسی طرح اقامت دین کے بھی نہیں ہیں۔ قرآن نے ’عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ‘ اور ’يُحَافِظُوْنَ‘* کی تعبیرات سے بالکل واضح کر دیا ہے کہ وہ جب لوگوں کو نماز قائم کرنے کا حکم دیتا ہے تو اُس سے اُس کی مراد کیا ہوتی ہے۔ یعنی یہی کہ اُس کا اہتمام رکھو، اُس کی حفاظت کرو اور اُس پر قائم رہو۔ یہی بات یہاں دین کے بارے میں فرمائی ہے۔ چنانچہ اقامت دین، جیسا کہ بعض اہل علم نے سمجھا ہے، دین کے فرائض میں سے ایک فرض اور اُس کے احکام میں سے ایک حکم نہیں ہے کہ اُسے ”فریضۂ اقامت دین“ قرار دے کر فرائض دینی میں ایک فرض کا اضافہ کیا جائے، بلکہ پورے دین کے متعلق ایک اصولی ہدایت ہے، بالکل اُسی طرح جیسے ’وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا‘** (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ میں نہ پڑو) ایک اصولی ہدایت ہے۔

۹۲۔ یعنی پورے کا پورا اختیار کرو، جس طرح کہ وہ ہے اور جس نظم و ترتیب کے ساتھ دیا گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ

* المعارج ۷۰: ۲۳، ۳۴۔

** اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۳۔

اِلَيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِيۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يُّنِيۡبُ ﴿۱۳﴾

وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡرِثُوا
الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ﴿۱۴﴾

طرف اِن مشرکوں کو بلا رہے ہو (کہ یہ خدا کو ایک مانیں)، وہ اِن پر بہت شاق گزر رہی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے،[۹۳] لیکن اپنی طرف آنے کی راہ وہ اُنھی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ۱۳

(اور یہ جو اِن پیغمبروں کے ماننے والے ہیں)، یہ صحیح علم اپنے پاس آچکنے کے بعد محض آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے متفرق ہو گئے ہیں۔ اور تمھارے پروردگار کی طرف سے اگر ایک مقرر مدت تک مہلت کی بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو اِن کے درمیان اُسی وقت فیصلہ کر دیا جاتا۔ (پھر یہی نہیں)، اِن کے بعد جو (خدا کی طرف سے) اُس کی کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اُس کتاب کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جو سخت الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔[۹۴] ۱۴

اُس میں اپنی طرف سے کمی بیشی کر دو یا اُس کی ترجیحات خود طے کر و یا اپنی تاویلات سے اُس کو کچھ کا کچھ بنا دو۔ اِن میں سے جو کام بھی کرو گے، اُس کا لازمی نتیجہ تفرقہ ہو گا۔

۹۳۔ اصل میں 'يَجۡتَبِىۡۤ اِلَيۡهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اِلٰى' اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔

۹۴۔ یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو اپنا دین اِس ہدایت کے ساتھ دیا کہ اُس میں تفرقہ پیدا نہ کیا جائے تو اُن کی امتوں میں جو تفرقہ پیدا ہوا، یہاں تک کہ حاملین کتاب بھی اُس سے محفوظ نہیں رہے اور اب وہ اپنی کتاب ہی کے بارے میں نہایت اضطراب انگیز شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں تو اِس کی بنیاد علم و استدلال یا تحقیق و اجتہاد پر نہیں تھی، یہ محض ضدم ضدا اور باہمی عناد کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ورنہ صحیح علم آچکنے کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ کسی چیز کے سمجھنے میں کوئی جزوی اختلاف ہو جائے، مگر وہ اِس طرح کے تفرقے کی

فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ
بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمۡ ؕ
لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ
بَیۡنَنَا ۚ وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿ؕ۱۵﴾
وَ الَّذِیۡنَ یُحَآجُّوۡنَ فِی اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِیۡبَ لَہٗ حُجَّتُہُمۡ دَاحِضَۃٌ

سو، (اے پیغمبر)، تم اُسی دین کی دعوت دو (جو سب پیغمبروں کا دین ہے) اور جس طرح تم کو حکم دیا گیا ہے، اُس پر مضبوطی سے جمے رہو اور اِن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو[95] اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی اتاری ہے، میں اُس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں (حق و باطل کے معاملے میں) تمھارے درمیان انصاف کا فیصلہ کر دوں۔ (یاد رکھو)، اللہ ہی ہمارا پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔[96] (تم نہیں مانتے تو) ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ (قیامت کے دن) ہم سب کو جمع کرے گا اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ ۱۵

جو لوگ اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہیں (کہ اُس کے شریک ثابت کریں)، اِس کے بعد

صورت کبھی اختیار نہیں کرتا کہ ایک دوسرے کی تکفیر کی جائے یا اُس کو ضال و مضل قرار دیا جائے اور ایک ہی دین کے ماننے والے ایک دوسرے کے جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائیں۔

۹۵۔ یعنی اُن بدعتوں کی، جو اُنھوں نے اپنی خواہشوں سے دین میں پیدا کر رکھی ہیں۔

۹۶۔ مطلب یہ ہے کہ وہی مولیٰ و مرجع ہے، لہٰذا اُسی کے سامنے ہماری بھی پیشی ہونی ہے اور تم بھی اُسی کے حضور میں پیش کیے جاؤ گے۔ وہاں کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں ہو گا کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی شخص اُس کی طرف رجوع کرے۔

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿١٦﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ
قَرِيْبٌ ﴿١٧﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ
وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿١٨﴾
اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿١٩﴾ مَنْ كَانَ

کہ اُس کی دعوت (اُن کی طرف سے[۹۷]) قبول کی جا چکی ہے، اُن کی حجت اُن کے پروردگار کے آگے بالکل پسپا ہونے والی ہے اور اُن پر غضب اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔۱۶

اللہ ہی ہے جس نے اپنی یہ کتاب قول فیصل کے ساتھ اتاری ہے اور (اِس طرح حق و باطل کو الگ الگ کرنے کے لیے) اپنی میزان نازل کر دی ہے۔ (انھیں توفیق ہو تو اِس سے فائدہ اٹھا لیں، ورنہ) تم کو کیا پتا کہ شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو! اُس کے لیے وہی جلدی مچا رہے ہیں جو اُس پر ایمان نہیں رکھتے۔[۹۸] ایمان والے تو اُس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقیناً برحق ہے۔ سنو، جو لوگ قیامت (جیسی حقیقت) کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ گم راہی میں بہت دور جا چکے ہیں۔۱۷-۱۸

(اِن کو یہ ڈھیل اِس لیے مل رہی ہے کہ) اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ (اُن کی نافرمانی کے باوجود)، وہ جس کو چاہتا ہے، رزق عطا فرماتا ہے اور (یہ اِس ڈھیل سے بے خوف نہ ہوں، اِس لیے کہ) وہ بڑی قوت والا ہے، بڑا ہی زبردست ہے۔[۹۹] (لوگو، ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ)

۹۷۔ یعنی قریش مکہ اور یہود و نصاریٰ کی طرف سے، جن میں سے ہر ایک خدا کو مانتا تھا۔

۹۸۔ چنانچہ استہزا کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔

۹۹۔ لہٰذا اُس کو کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اِس ڈھیل کے نتیجے میں یہ اُس کی گرفت سے نکل جائیں گے۔

يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ
مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿٢٠﴾

جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اُس کی کھیتی میں اُس کے لیے برکت عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی اُس کا حصہ اُسے دیتے ہیں[۱۰۰] اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے، اُس کو ہم اُس میں سے (جتنا چاہتے ہیں)، دے دیتے ہیں، مگر (اِس کے بعد پھر) آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔۱۹-۲۰

۱۰۰۔ یہ الفاظ اصل میں بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ یہ تقابل کے اصول پر ہے، اِس لیے کہ دوسرے ٹکڑے میں ’نُؤْتِهٖ مِنْهَا‘ کے الفاظ موجود ہیں۔

[باقی]

سیرة النبی

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز

شقِ قمر کا واقعہ

—— ۱ ——

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ، قَالَ:[۱] [فِي هَذِهِ الْآيَةِ ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾[۲]][۳] بَيْنَمَا نَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًى إِذَا انْفَلَقَ الْقَمَرُ فِلْقَتَيْنِ، فَكَانَتْ فِلْقَةٌ وَرَاءَ الْجَبَلِ، وَفِلْقَةٌ دُونَهُ،[۴] [حَتَّى نَظَرُوا إِلَيْهِ،][۵] فَقَالَ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «اشْهَدُوا».

[فَقَالَتْ قُرَيْشٌ: هَذَا سِحْرُ ابْنِ أَبِي كَبْشَةَ قَالَ: فَقَالُوا: انْتَظِرُوا مَا يَأْتِيكُمْ بِهِ السُّفَّارُ، فَإِنَّ مُحَمَّدًا لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَسْحَرَ النَّاسَ كُلَّهُمْ][۶] [فَسَلُوا السُّفَّارَ حِينَ يَقْدَمُونَ عَلَيْكُمْ، فَإِنْ كَانَ مِثْلُ مَا رَأَيْتُمْ فَقَدْ صَدَقَ، وَإِلَّا فَهُوَ سِحْرٌ سَحَرَكُمُوهُ ابْنُ أَبِي كَبْشَةَ، فَقَدِمُوا السُّفَّارُ فَسَأَلُوهُمْ قَالُوا: نَعَمْ قَدْ رَأَيْنَاهُ، قَدِ انْشَقَّ الْقَمَرُ][۷]».

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے (قرآن کی) آیت 'اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ' کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا: ایک روز، جب کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مِنیٰ میں موجود تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چاند دو ٹکڑوں میں شق ہو گیا، ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا اور ایک اُس کے آگے (دکھائی دیتا) تھا۔ (یہ منظر اتنا نمایاں تھا کہ) سب لوگوں نے اِسے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس موقع پر ہم سے فرمایا: لوگو، (اِس واقعے کے) گواہ رہنا۔[1]

(مسلمان تو اِس کے گواہ بنے، البتہ) کفارِ قریش نے (اپنے لوگوں سے) کہا: یہ تو ابن ابی کبشہ کا جادو ہے۔[2] راوی کہتا ہے: پھر اُنھوں نے کہا: انتظار کرو اور دیکھو، باہر سے آنے والے مسافر کیا خبر لاتے ہیں، اِس لیے کہ محمد تمام انسانوں پر جادو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب مسافر تمھارے پاس آئیں تو اُن سے پوچھنا: (کیا اُنھوں نے بھی یہ منظر دیکھا ہے)؟ اگر وہ بھی کہیں کہ اُنھوں نے تمھاری طرح دیکھا ہے تو پھر یہ حقیقت ہے، ورنہ یہ ایک جادو ہے، جو ابن ابی کبشہ نے تم پر کر دیا ہے۔ چنانچہ جب مسافر آئے تو لوگوں نے اُن سے پوچھا۔ اُنھوں نے بتایا: ہاں، یقیناً ہم نے بھی چاند کا یہ شق ہونا دیکھا تھا۔

۱۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آنے والے ایک واقعے کا ذکر ہے، جس کا حوالہ قرآن نے بھی دیا ہے اور اِس سے عذاب اور قیامت کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے پیش آیا۔ قمری مہینے کی چودھویں رات تھی۔ چاند تھوڑی دیر پہلے طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ شق ہوا اور اُس کا ایک ٹکڑا، جس طرح کہ روایت میں بیان ہوا ہے، سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ ایک لحظے کے لیے لوگوں نے یہ کیفیت دیکھی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم مل گئے۔

۲۔ ابن ابی کبشہ غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی آبا میں سے کسی کا نام تھا۔ اہل عرب کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی کا ذکر حقارت سے کرنا مقصود ہوتا تو اُس کو اِسی طرح اُس کے اپنے آبا کے بجائے کسی غیر معروف جد سے منسوب کر دیتے تھے۔

متن کے حواشی

۱۔اِس روایت کا متن اصلاً صحیح مسلم، رقم ۲۴۹ ۷سے لیا گیا ہے۔اِس کے راوی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔

اِس کے متابعات اِن مصادر میں منقول ہیں:

مسند ابو داؤد طیالسی، رقم ۲۹۳۔ کتاب الفتن، نعیم بن حماد، رقم ۱۶۸۳، ۱۶۸۶۔ مسند ابن ابی شیبہ، رقم ۲۲۵۔ مسند احمد، رقم ۳۵۸۳، ۳۹۲۴، ۴۲۷۰، ۴۳۶۰۔ صحیح بخاری، رقم ۳۶۳۶، ۳۸۶۹، ۳۸۷۱، ۴۸۶۴، ۴۸۶۵۔ صحیح مسلم، رقم ۷۲۵۰، ۷۲۵۱۔ سنن ترمذی، رقم ۳۲۸۵، ۳۲۸۷۔ مسند بزار، رقم ۱۸۰۱، ۱۸۰۲، ۱۷۹۱۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۴۸۸، ۱۱۴۸۹۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۴۹۶۸، ۵۰۷۰، ۵۱۹۶۔ شرح مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۶۹۷، ۶۹۸، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳۔ مسند شاشی، رقم ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۴۹۵۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۰۰۰۹۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ، اللالکائی، رقم ۱۴۵۹، ۱۵۶۰۔ دلائل النبوۃ، ابو نعیم، رقم ۲۱۱۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲/ ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶۔

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ روایت تین صحابۂ کرام: عبد اللہ ابن عباس، عبد اللہ ابن عمر اور جبیر بن مطعم رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی مروی ہے۔

عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اِس کے شواہد درج ذیل مصادر میں دیکھے جا سکتے ہیں:

صحیح بخاری، رقم ۳۶۳۸، ۳۸۷۰، ۴۸۶۶۔ صحیح مسلم، رقم ۲۸۰۵۔ مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۷۰۴۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۰۷۳۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۷۵۸۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ، اللالکائی، رقم ۱۴۶۶۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲/ ۲۶۷۔

عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اِس کے شواہد اِن مراجع میں منقول ہیں:

مسند طیالسی، رقم ۲۰۰۳۔ صحیح مسلم، رقم ۲۸۰۳۔ سنن ترمذی، رقم ۲۱۸۲۔ معجم ابن الاعرابی، رقم ۱۸۱۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۴۹۶۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲/ ۲۶۷۔

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے اِس کے شواہد اِن کتابوں میں موجود ہیں۔

مسند احمد، رقم ۱۶۳۰۸۔ اخبار مکہ، فاکہی، رقم ۲۴۳۵۔ سنن ترمذی، رقم ۳۲۸۹۔ مسند بزار، رقم ۳۴۳۵۔

صحیح ابن حبان، رقم ۶۴۹۷۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۵۵۹، ۱۵۶۱۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲۶۸/۲۔

شق قمر کی یہی روایت اِن صحابہ کے علاوہ انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔اُس میں قریش کی طرف سے نشانی کے مطالبے کے بعداِس واقعے کے پیش آنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ اُسے دوسرے متن کے طور پر آگے بیان کیا جارہا ہے۔

۲۔ القمر ۵۴: ۱۔

۳۔ مسند احمد، رقم ۴۲۷۰۔

۴۔ بعض روایات، مثلاً مسند احمد، رقم ۳۹۲۴ میں اِس جگہ ’حَتَّى رَأَيْتُ الْجَبَلَ مِنْ بَيْنِ فُرْجَتَيِ الْقَمَرِ‘، ”حتیٰ کہ میں نے چاند کے اُن دو ٹکڑوں کے درمیان پہاڑ کو دیکھا“ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔اِسی طرح بعض روایات، مثلاً سنن ترمذی، رقم ۳۲۸۹ میں اِس جگہ ’حَتَّى صَارَ فِرْقَتَيْنِ عَلَى هَذَا الْجَبَلِ وَعَلَى هَذَا الْجَبَلِ‘، ”یہاں تک کہ ایک ٹکڑا اس پہاڑ پر اور ایک اُس پہاڑ پر تھا“ کے الفاظ آئے ہیں اور بعض روایات، مثلاً اخبار مکہ، فاکہی، رقم ۲۴۳۵ میں اِس جگہ ’حَتَّى رَأَيْتُ حِرَاءً بَيْنَ شِقَتَيْهِ‘، ”حتیٰ کہ میں نے دونوں ٹکڑوں کے درمیان حرا پہاڑ کو دیکھا“ کے الفاظ منقول ہیں۔

۵۔ مسند احمد، رقم ۳۵۸۳۔

۶۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲۶۵/۲۔

۷۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ، اللالکائی، رقم ۱۴۶۰۔

— ۲ —

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ:[۱] سَأَلَ أَهْلُ مَكَّةَ (رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) أَنْ يُرِيَهُمْ آيَةً، [(ف)[۲] انْشَقَّ الْقَمَرُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ][۳] فَأَرَاهُمُ انْشِقَاقَ الْقَمَرِ.

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: مکہ والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ انھیں کوئی بڑی نشانی دکھائیں،[۱] چنانچہ آپ کے زمانے ہی میں چاند پھٹا تو آپ

نے اُنھیں چاند کا یہ پھٹنا دکھایا۔[۲]

۱۔ یعنی کوئی ایسی نشانی، جس سے وہ یقین کر سکیں کہ جس قیامت کی آپ منادی کر رہے ہیں، وہ فی الواقع زمین و آسمان کو درہم برہم کر دے سکتی ہے۔

۲۔ قرآن نے اِس کو اِسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ کوئی معجزہ نہیں تھا، جو لوگوں کے مطالبے پر دکھایا گیا، بلکہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت سے پیش آیا اور قرآن نے اِس سے استدلال کرتے ہوئے اُنھیں توجہ دلائی کہ اِس کائنات کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی، خواہ وہ کتنی بڑی ہو، ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ یہ زمین و آسمان اور اِن کی سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں، لہٰذا متنبہ ہو جاؤ، وہ جب چاہے گا، اِن کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۴۸۶۷ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اِس کے متابعات اِن مصادر میں منقول ہیں:

مسند طیالسی، رقم ۲۰۷۲۔ مسند احمد، رقم ۱۳۹۱۸، ۱۳۹۱۹، ۱۳۹۵۸۔ صحیح بخاری، رقم ۴۸۶۸۔ صحیح مسلم، رقم ۲۸۰۲۔ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۲۹۲۹، ۲۹۳۰، ۳۱۴۱۔ شرح مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۷۰۸۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ، اللالکائی، رقم ۱۴۶۱۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲/ ۲۶۴۔

اِس روایت کا کوئی شاہد نہیں ہے۔

۲۔ مسند ابن ابی شیبہ، رقم ۲۲۵۔

۳۔ صحیح مسلم، رقم ۲۸۰۲۔

المصادر و المراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶م). **العلل**. ط۱. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (۱۲۷۱ھ/۱۹۵۲م). **الجرح والتعديل**. ط۱. حيدر آباد الدكن.

الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن أبي شيبة أبو بكر عبد الله بن محمد العبسي. (١٩٩٧م). **المسند**. ط١. تحقيق: عادل بن يوسف العزازي وأحمد بن فريد المزيدي. الرياض: دار الوطن.

ابن الأعرابي أحمد بن محمد. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **معجم ابن الأعرابي**. ط١. تحقيق وتخريج: عبد المحسن بن إبراهيم. السعودية: دار ابن الجوزي.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠هـ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

إبن حبان، محمد بن حبان البُستي. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: لبنان. مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط١. تحقيق: د. عاصم بن عبد الله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن حماد أبو عبد الله نعيم بن حماد. (١٤١٢هـ). **كتاب الفتن**. ط١. تحقيق: سمير أمين الزهيري. مكتبة التوحيد: القاهرة.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن عدي عبد الله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط١. تحقيق:

عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات.** ط٢. تحقيق: عبد القيوم عبد رب النبي. مكة مكرمة: المكتبة الامدادية.

ابن المِبرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم.** ط١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل.** ط٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩هـ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين.** ط١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

أبو اسحاق الحويني. (١٤٣٣هـ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال.** ط١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل.** ط١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **دلائل النبوة.** ط٢. تحقيق: الدكتور محمد رواس قلعه جي، وعبد البر عباس. بيروت: دار النفائس.

أبو يعلى أحمد بن علي. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **مسند أبي يعلى.** ط١. تحقيق: حسين سليم أسد. دمشق: دار المأمون للتراث.

أحمد بن محمد بن حنبل. (١٤١٦هـ/١٩٩٥م). **مسند أحمد.** ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط – عادل مرشد، وآخرون. إشراف: د. عبد الله بن عبد المحسن التركي. بيروت: مؤسسة الرسالة.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال.** ط٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال.** ط١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت: دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل. (١٤٢٢هـ). **الجامع الصحيح**. ط١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧هـ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط١. حلب. القاهرة: دار الوعي مكتبة دار التراث.

البزار أحمد بن عمرو. (٢٠٠٩م). **مسند البزار**. ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله، وعادل بن سعد، وصبري عبد الخالق الشافعي. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

البيهقي أبو بكر أحمد بن الحسين. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **دلائل النبوة**. ط١. المحقق: د. عبد المعطي قلعجي. بيروت: دار الكتب العلمية، القاهرة: دار الريان للتراث.

الترمذي محمد بن عيسى. (١٣٩٥هـ/١٩٧٥م) .**سنن الترمذي**. ط٢. تحقيق وتعليق: أحمد محمد شاكر (ج١، ٢) ومحمد فؤاد عبد الباقي (ج٣) وإبراهيم عطوة عوض المدرس في الأزهر الشريف (ج٤، ٥). مصر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي.

الحاكم محمد بن عبد الله المعروف بابن البيع. (١٤١١هـ/١٩٩٠م). **المستدرك على الصحيحين**. ط١. تحقيق: مصطفى عبد القادر عطاء. بيروت: دار الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض. دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط٢. تحقيق: حماد بن محمد الانصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط١.

تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة: دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط١. تحقيق: يحيى شفيق حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت: عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

الشاشي الهيثم بن كليب. (١٤١٠هـ). **مسند الشاشي**. ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

الصنعاني عبد الرزاق بن همام. (١٤١٠هـ). **تفسير القرآن**. ط١. تحقيق: د. مصطفى مسلم محمد. الرياض: مكتبة الرشد.

الطبراني سليمان بن أحمد. (د.ت). **المعجم الكبير**. ط٢. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي. القاهرة: مكتبة ابن تيمية.

الطبراني أبو القاسم سليمان بن أحمد الشامي. (١٤٠٥هـ/١٩٨٤م). **مسند الشاميين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبدالمجيد السلفي. بيروت: مؤسسة الرسالة.

الطحاوي أحمد بن محمد. (١٤١٥هـ/١٩٩٤م). **شرح مشكل الآثار**. ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. دار النشر مؤسسة الرسالة.

الطيالسي سليمان بن داود. (١٤١٩هـ/١٩٩٩م). **مسند أبي داود الطيالسي**. ط١. تحقيق: الدكتور محمد بن عبد المحسن التركي. مصر: دار هجر.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة: مكتبة الدار.

الفاكهي أبو عبد الله محمد بن إسحٰق المكي. (١٤١٤م). **أخبار مكة في قديم الدهر وحديثه**. ط٢. تحقيق: د. عبد الملك عبد الله دهيش. بيروت: دار خضر.

الكَشّي أبو محمد عبد الحميد. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **المنتخب من مسند عبد بن حميد**. ط١. تحقيق: صبحي البدري السامرائي، محمود محمد خليل الصعيدي. القاهرة: مكتبة السنة.

اللالكائي أبو القاسم هبة الله بن الحسن الرازي. (١٤٢٣هـ/٢٠٠٣م). **شرح أصول اعتقاد أهل السنة**

والجماعة. ط٨. تحقيق: أحمد بن سعد بن حمدان الغامدي. الرياض: دار طيبة.

مسلم بن الحجاج النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د.ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢ھ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

النسائي أحمد بن شعيب. (١٤١١ھ/١٩٩١م). **السنن الكبرى**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

ڈاکٹر ساجد حمید

اسلام اور تاریخیت؟

عہد حاضر کے مسلمانوں میں تاریخیت کا ایک تصور جس کے بانی ڈاکٹر فضل الرحمٰن مرحوم تھے، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ کسی قرآنی حکم کے بارے میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ:

''ہم پہلے نزول وحی کے زمانے میں چلے جائیں گے، وہاں کی انتھروپالوجی (بشریات) اور سوشیالوجی (عمرانیات) کے ساتھ ساتھ، آیات کے زمانی و مکانی نزول کو اس زندہ معاشرے کے اندر ٹھیک طرح سمجھ لیں۔ مثال کے طور پر اس دور میں، ایک آیت کس ماحول میں، کن شرائط کے تحت نازل ہوئی ہے۔ اس سبب نزول اور علت کو جان کر، اور ان علائق سے اپنے لیے ایک عملی راہ نکال کر، اس حکم کی پس پردہ وجوہ اور اس کی غایت سمجھ کر، اس کی تثبیت میں اس مقصد الٰہی کو ساتھ لیے اپنے آج کے دور میں واپس آیا جائے، اور اس مقصد کو عملی زندگی میں لاگو کر لیا جائے، اس مقصد الٰہی کو آج اپنے زمانے پر منطبق کر لیا جائے[1]۔''

مدرسہ ڈسکورسز اسی نہج پر ''ترقی'' کرتے ہوئے بہت آگے نکل آیا ہے، ہم نے چند برس قبل اس کا تعاقب لکھا تھا[2]۔ آج تاریخیت ہی سے متعلق مصطفیٰ اوزترک صاحب —— جو ترکی میں ایک معروف صاحب علم ہیں —— کا ایک مضمون سہ ماہی ''تدبر''[3] میں دیکھنے کو ملا، ہماری یہ تحریر ان کے نقطۂ نظر کے بنیادی نکتہ کا ناقدانہ جائزہ

۱۔ سہ ماہی تدبر، لاہور، شمارہ ۹۹، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۱۳۲۔

۲۔ دیکھیے مصنف کا مضمون: ''مدرسہ ڈسکورس اور روایتی مدرسہ''، ماہنامہ اشراق، دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۵۴۔

۳۔ سہ ماہی تدبر، لاہور، شمارہ ۹۹، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۱۳۲۔

ہے، جس کا مقصد اس روش کی فروگذاشت واضح کرنا ہے۔

تاریخیت سے شریعت کا تعطل

اس تصور کا ایک پہلو یہ ہے کہ مرور وقت کے ساتھ زندگی میں ایسی تبدیلیاں آتی ہیں جن کی وجہ سے کسی شرعی حکم پر عمل کرنا ممکن نہیں رہتا، لہٰذا امت اس حکم پر عمل کرنا ترک کر دیتی ہے جس سے وہ حکم منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک مثال ابن عربی کی کتاب ''احکام القرآن'' میں سے دی گئی ہے، سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۵۸ میں تین اوقات میں گھر میں آنے کی اجازت مانگنے کا حکم دیا گیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِیَسۡتَاۡذِنۡکُمُ الَّذِیۡنَ مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ وَالَّذِیۡنَ لَمۡ یَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ مِنۡکُمۡ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ وَحِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَکُمۡ مِّنَ الظَّهِیۡرَۃِ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ ؕ۟ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّکُمۡ ؕ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ وَلَا عَلَیۡهِمۡ جُنَاحٌۢ بَعۡدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوۡنَ عَلَیۡکُمۡ بَعۡضُکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ۔[۲۴]

اس آیت پر اس کتاب میں ایک بحث یہ کی گئی ہے:

هل الآية محكمة أو منسوخة؟ فقال ابن عمر: هي محكمة يعني في الرجال خاصة.

''درج بالا آیت سے متعلق یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا یہ محکم ہے کہ منسوخ ہو چکی ہے؟ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ محکم ہے، یعنی مردوں کے لیے بالخصوص محکم ہے۔

وقال ابن عباس: قد ذهب حكمها؛ روى عكرمة أن نفرًا من أهل العراق سألوا ابن عباس، فقالوا: يا ابن عباس،

جب کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کا حکم موقوف ہو چکا ہے۔ عکرمہ نے یہ بات بتائی

---

[۲۴] ''ایمان والو، (تمھارے قلب و نظر کی پاکیزگی کے لیے جو ہدایات ہم نے دی ہیں، تم اُن کی مزید وضاحت چاہتے ہو تو سنو)، تمھارے غلام اور لونڈیاں اور تم میں جو بلوغ کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تم سے اجازت لے کر تمھارے پاس آیا کریں: نماز فجر سے پہلے؛ جب دوپہر کو تم کپڑے اتارتے ہو اور نماز عشا کے بعد۔ یہ تین وقت تمھارے لیے پردے کے وقت ہیں۔ اِن کے علاوہ (وہ بلا اجازت آجائیں تو) نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ اُن پر، اِس لیے کہ تم ایک دوسرے کے پاس آنے جانے والے ہی ہو۔ اللہ تمھارے لیے اِسی طرح اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔''

كيف ترى في هذه الآية التي أمرنا فيها بما أمرنا، فلا يعمل بها أحد؛ قول الله: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾[5] وقرءوها إلى قوله تعالى: عَلٰى بَعْضٍ.

فقال ابن عباس: إن الله رفيق بجميع المؤمنين يحب الستر. وكان الناس ليس لبيوتهم ستور ولا حجال، فربما دخل الخادم أو ولده أو يتيمة الرجل، والرجل على أهله؛ فأمر الله بالاستئذان في تلك العورات، فجاءهم الله بالستور، والخير، فلم أر أحدًا يعمل بذلك.

(احکام القرآن ۳/ ۴۱۴)

ہے کہ عراق سے ایک گروہ آیا، انھوں نے ابن عباس سے سوالات کیے، انھوں نے ابن عباس سے کہا کہ آپ کی اس آیت میں ہمیں دیے گئے حکم کے بارے میں کیا راے ہے؟ اس لیے کہ ہمارے ہاں اس پر کوئی بھی عمل نہیں کرتا، انھوں نے یہ آیت 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے 'عَلٰی بَعْضٍ' تک پڑھی۔

تو ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سب مومنین کے رفیق ہیں، ان کی ستر پوشی کو پسند فرماتے ہیں، جب کہ صورت یہ تھی کہ لوگوں کے گھروں میں نہ پردے تھے نہ الگ زنان خانے۔ اس صورت میں خادم، لڑکے بالے، گھروں میں رہنے والے یتیم بچے بچیاں بلا جھجک اندر آجاتے تھے، جب کہ شوہر اہلیہ کے پاس ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے پردے کے تین اوقات میں اجازت لینے کا حکم دیا۔ پھر اللہ نے لوگوں کو پردے اور مال عطا کر دیا، تو اب لوگ اس حکم پر عمل نہیں کرتے[6]۔"

مصطفیٰ اوز صاحب اس سے یہ استدلال کرتے ہیں:

۵۔ النور ۲۴: ۵۸۔

۶۔ اس پر ابن عربی کا اپنا تبصرہ یوں ہے:

وَهَذَا ضَعِيفٌ جِدًّا بِمَا بَيَّنَّاهُ فِي غَيْرِ مَوْضِعٍ مِنْ أَنَّ شُرُوطَ النَّسْخِ لَمْ تَجْتَمِعْ فِيهِ مِنْ الْمُعَارَضَةِ، وَمِنْ التَّقَدُّمِ وَالتَّأَخُّرِ، فَكَيْفَ يَصِحُّ لِنَاظِرٍ أَنْ يَحْكُمَ بِهِ؟ (احکام القرآن ۳/ ۴۱۴)

"اور یہ قول بہت ہی کم زور ہے، جیسا کہ ہم نے دیگر مقامات پر واضح کیا ہے، اس لیے کہ اس میں نسخ کے شرائط —— معارضہ، تقدم و تاخر —— جمع نہیں ہوئے۔ تو پھر کسی صاحب نظر کے لیے یہ حکم لگانا کیسے درست ہو سکتا ہے۔"

”تاریخیت اس آیت کریمہ کے اس دور کی عرب ذہنیت اور سوشیالوجی (عمرانیات) سے مخصوص ہونے کا اندراج کرتی ہے۔ آج کے زمانے میں ہماری معاشرت میں، قیاس کرتے وقت، اس حکم پر عمل کرنے کے لیے سبب اور علت ہی موجود نہیں ہیں۔ آپ کے اپارٹمنٹس میں بغیر بتائے، بلا دستک دیے کسی کے اندر آنے کا احتمال ہی نہیں ہے... آج یہ حکم ملغیً ہے، یعنی اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔[1]“

یہ دونوں نتیجے نکالنا درست نہیں ہے کہ تاریخیت سے دینی احکام ملغیً ہو جاتے ہیں، اور یہ کہ یہ آیت عرب ذہنیت اور عمرانیات سے خاص ہے۔ ایک اس لیے کہ پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ یہ حکم کے متروک ہونے کی مثال نہیں ہے، بلکہ حکم الٰہی پر شدت سے عمل کی صورت ہے، یعنی پہلے لوگ تین مواقع پر اجازت لینے کے مکلف تھے، جب کہ اب وہ کسی کے گھر آنے کے لیے ہر وقت اجازت لیتے ہیں۔ لہٰذا گھر میں داخل ہونے پر اجازت کی ذہنیت اب تمام اقوام کی ہے، اور یہ کام ابن عباس رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ہو چکا تھا، جب کہ تاریخت نے کوئی خاص سفر طے نہیں کیا تھا۔

دوسرے اس لیے کہ احکام کا معطل ہونا تاریخیت کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ ”موجبات عمل“ کے فقدان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ موجبات کی وجہ سے، تاریخی بدلاؤ کے بغیر ہی بہت سے احکام ہیں، جو صادر ہوتے وقت ہی موقوف ہو سکتے ہیں، مثلاً جب یہ آیت اتری ہو گی تو اس وقت بھی جن گھروں پر دروازے تھے، انھوں نے بھی ان تین اوقات میں اس پر عمل نہیں کیا ہو گا، بلکہ ہر دفعہ گھر میں آنے کی اجازت طلب کی ہو گی یا جن گھروں میں صرف میاں بیوی ہی رہ رہے تھے اور دیگر افراد نہیں تھے، ان میں بھی اس حکم پر عمل موقوف تھا۔ غرض یہ کہ یہ تاریخیت اس تعطل کا عامل نہیں ہے۔ یہ موقوف ہونا، موجبات کے فقدان تک ہی ہوتا ہے، ان کے میسر آنے پر حکم پھر سے عملاً بحال ہو جاتا ہے۔

موجبات عمل سے مراد وہ امور ہیں، جن کی نہ صرف حکم پر عمل کے لیے، بلکہ اس کے وجوب کے لیے بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک موجب وقت ہے، ان تین اوقات میں سے کسی وقت کا ہونا لازم ہے، جب وقت نہیں ہو گا تو اجازت طلب نہیں کی جائے گی۔ اس حکم کا دوسرا موجب مکلف کا موجود ہونا ہے، یعنی گھر میں 'الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ' جیسے افراد ہوں گے تو اس حکم پر عمل ہو گا، دوسری صورت میں عمل نہیں ہو گا۔ اس حکم کا تیسرا موجب وجۂ حکم ہے۔ یہاں وجۂ حکم تین وقتوں میں

---

[1] سہ ماہی تدبر، لاہور، شمارہ ۹۹، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۱۳۵۔

’تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ‘ کا معمول ہونا ہو گا تاکہ ان اوقات میں ’عَوْرٰتٍ لَّكُمْ‘ کا ہونا ثابت ہو تو پھر یہ حکم عمل میں آئے گا، وگرنہ اس وقت تک موقوف ہو گا۔ خود نزول قرآن کے وقت یہ ’غیر مسکونۃ‘ مکانات (النور ۲۴: ۲۹) کے لیے موقوف تھا، ان میں اجازت لینے سے رخصت دی گئی ہے۔ یہ اس حکم کے موجبات ہیں۔ حکم کے موقوف ہونے کا تاریخیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ان موجبات کے عدم وجود سے ہے۔ دروازے والے جدید گھروں میں، جیسے ہم نے عرض کیا، اس حکم سے کچھ زیادہ ہی عمل ہو رہا ہے کہ ہر آمد پر اجازت طلب کی جاتی ہے۔ تو جب کسی حکم پر ایسا عمل ہو رہا ہو کہ شریعت کا تقاضا اس میں شامل ہو تو بس تعمیل ہو گئی۔ یہ اسی طرح کی صورت حال ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ’اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا‘، ”جب نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو“ (المائدہ ۵: ۶) تو جو آدمی سارا دن باوضو رہتا ہو، وہ نماز کے لیے اٹھے گا تو وضو نہیں کرے گا۔ تو کیا اس کو یہ کہا جائے گا کہ اس نے وضو کرنے کے اس حکم پر عمل نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے وضو کے حکم پر زیادہ شدت سے عمل کر ڈالا ہے، اس لیے جب وہ باوضو ہے تو نماز کے لیے اٹھتے وقت وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ تین اوقات میں اجازت کے اس حکم کے موجبات کو ایک گوشوارے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

تین وقت اجازت کے موجبات						
مکلف	استطاعت	وجۂ حکم	علت	ذریعہ	وقت	حکم
گھر کے افراد	اندر آ سکنا	دروازہ نہ ہونا	بے پردگی	مسکونہ گھر	تین اوقاتِ بے لباسی	اجازت لینا

اسی طرح تین اوقات کی تبدیلی بھی تاریخیت سے وابستہ نہیں ہے۔ ’عَوْرٰتٍ لَّكُمْ‘ سے واضح ہے کہ بے پردگی کے موقع پر اجازت لینی چاہیے، جس گھر یہ معاملہ تین دفعہ ہو، وہاں تین دفعہ جہاں دو دفعہ ہو، وہاں دو دفعہ۔ ایسا ہی عہد نبوی میں تھا، اور ایسا ہی آج ہو گا۔ یہ بات تو اجماعی ہے کہ جب مکلف مجنون ہو یا مدہوش ہو جائے تو وہ شرائع کا مکلف نہیں رہتا، اس لیے کہ استطاعت کا موجب ناپید ہو گیا ہے۔ یہ ہمارے نقطۂ نظر کی ایک واضح تائیدی مثال ہے کہ موجبات کے فقدان سے حکم اس وقت تک موقوف ہو جاتا ہے، جب تک موجبات میسر نہ ہو جائیں۔

اب موجبات والے تصور کو سمجھنے کے لیے تعبدی امور میں سے بھی ایک مثال پر غور کر لیتے ہیں۔ ’يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا...‘ (المائدہ ۵: ۶) والے حکم میں وضو کے لیے موجبات میں

درج ذیل چیزیں ہیں:

موجبات وضو						
مکلف	استطاعت	وجۂ حکم	علت	ذریعہ	وقت	حکم
نمازی	عاقل بالغ مسلم	نماز	طہارت	پانی	نماز کے وقت	وضو کرنا

وضو کے ان موجبات میں سے کوئی ایک چیز موجود نہ رہے تو حکم موقوف ہو جائے گا۔اس کے لیے تاریخیت کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً کوئی نمازی نہ ہو تو وضو کا حکم موقوف ہو جائے گا، پانی نہ رہے تو وضو موقوف ہو کر تیمم بن جائے گا، وضو قائم ہو تو 'فَاغْسِلُوْا' موقوف ہو جائے گا۔ یہ حین نزول قرآن بھی موقوف ہوتے رہے اور تا قیامت موقوف اور بحال ہوتے رہیں گے۔

لہٰذا، تعبدی اور غیر تعبدی، دونوں امور میں ہم نے دیکھا کہ فیصلہ کن چیز موجبات عمل ہیں۔ وہ ہیں تو حکم عمل میں آئے گا، وگرنہ معطل ہو جائے گا۔ لیکن اسے منسوخ نہیں کہنا چاہیے، اس لیے کہ جیسے ہی موجبات فراہم ہوں گے، حکم پھر بحال ہو جائے گا۔ مثلاً پانی ملنے پر وضو اور نماز کا وقت ہونے پر نماز کا حکم بحال ہو جائے گا۔ واضح ہے کہ تاریخیت کا ان احکام میں کوئی کردار نہیں ہے۔ تاریخیت محض ایک نگاہوں کو لگنے والا دھوکا ہے۔ ہماری یہ راے قدیم فقہا کی راے کے مطابق ہے، بس فرق اتنا ہے کہ وہ بالعموم حکم کے معنی، یعنی علت کا ذکر کرتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ علت کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں جن کی وجہ سے حکم موقوف ہو جاتا ہے، جنھیں ہم نے 'موجبات' کا نام دیا ہے۔

تاریخیت سے دھوکا نہیں ہونا چاہیے، استیذان کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی میں ان گھروں کے لیے موقوف تھا، جن کے لوگوں کو روکنے کے لیے دروازے موجود تھے۔ ان لوگوں کے لیے بھی یہ عہد نبوی ہی میں حکم موقوف تھا، جن کے آنے جانے والے افراد یا بچے نہیں تھے۔ ان کے لیے بھی یہ حکم موقوف تھا، جو تجرد کی زندگی گزار رہے تھے، اور ان کے بے لباسی کے اوقات نہانے وغیرہ کے سوا کوئی اور نہ تھے۔ ان لوگوں کے لیے بھی یہ حکم موقوف تھا، جو ان اوقات میں غیر مسکونہ گھروں میں بیٹھے ہوں۔ ان کے لیے بھی یہ حکم موقوف تھا، جو ان اوقات میں کسی سفر میں ہوں۔ اسی طرح یہ حکم آج بھی ان گھروں میں قائم ہے، جس میں بچے رات کو یا قیلولہ کے وقت اپنے ماں باپ کے کمرے میں جانا چاہتے ہوں۔ ان بادیہ مکینوں کے لیے بھی یہ حکم آج بھی قائم ہے، جو بے در کے خیموں میں رہتے ہیں۔ اگر گھروں میں دوبارہ دروازے لگنے بند ہو جائیں تو

تین وقتہ اجازت کا حکم روبہ عمل ہو جائے گا۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ تاریخیت کا تصور یہاں غلط استعمال ہوا ہے، یہ محض غلط فہمی سی ہے، جس سے دینی احکام کے موقوف ہو جانے کے غلط تصور کو پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ تاریخیت قانون کو موقوف نہیں کرتی، بلکہ موجبات عمل کا فقدان اسے موقوف کرتا اور ان کا وجود اسے بحال کرتا ہے۔ تاریخیت تو تب فیصلہ کن ہوتی کہ اگر موجبات دوبارہ آموجود ہوں تو حکم تب بھی موقوف رہے۔ لگتا ہے بلا سوچے سمجھے ایک غیر متعلق عامل صرف اس لیے دریافت کر لیا گیا ہے کہ شریعت کے موقوف ہونے کا ایک دائمی موثر تراش لیا جائے۔ اوپر ابن عربی کی کتاب میں ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ حکم موقوف ہے، کیونکہ گھروں پر پردے اور دروازے لگ گئے ہیں۔

تعطل سے حکم کا نسخ

یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب تاریخیت کی وجہ سے امت ایک عمل ترک کرتی ہے تو اس سے وہ حکم منسوخ ہو جاتا ہے۔ اُوزترک صاحب فرماتے ہیں:

> ”تالیفِ قلوب کے ضمن میں، امام ابو منصور الماتریدی اپنی تاویلات القرآن میں حضرت عمر کا قصہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: وفي الآية دلالة جواز النسخ بالاجتهاد؛ لارتفاع المعنى الذي به كان[8] اس آیت کریمہ کی بنیاد، سبب بننے والی علت کے اٹھ جانے کی وجہ سے عمل کے نسخ ہونے پر دلیل موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجتہاد کے ساتھ نسخ ہو سکتا ہے، یعنی ایک مسلمان اجتہادی رویے سے کام لے کر کسی آیت کے اس وقت کے معنی، حکم کو اپنے عمل سے نسخ کر سکتا ہے۔[9]“

علامہ ماتریدی یہ نہیں کہہ رہے کہ حضرت عمر کا فتویٰ یا عمل دلالت کرتا ہے کہ اجتہاد سے عمل منسوخ ہونے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو کہہ رہے ہیں کہ 'وفي الآية دلالة' (آیت ہی میں یہ دلالت موجود ہے)۔ یہ وہی بات ہے جو ہم نے اوپر لکھی ہے۔ وہ تو کہہ رہے ہیں کہ علت —— جسے انھوں نے 'معنى الذي كان به' کے لفظ سے ادا کیا ہے —— موجود نہ ہو تو حکم بذریعۂ اجتہاد منسوخ ہو جائے گا۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہہ رہے

۸۔ اوزترک صاحب کے مضمون میں یہ عبارت غلط لکھی گئی ہے شاید کاتب کی کوتاہی کی وجہ سے، صحیح عبارت وہ ہے جو ہم نے نقل کر دی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اس آیت ہی میں اس کی دلالت ہے کہ اجتہاد سے اسے منسوخ مانا جائے، حکم کے معنی جس پر حکم کا مدار تھا اس کے اٹھ جانے کی بنا پر (تفسیر الماتریدی ۵/۴۰۷)۔

۹۔ سہ ماہی تدبر، لاہور، شمارہ ۹۹، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۱۳۵۔

کہ ”ایک مسلمان اجتہادی رویے سے کام لے کر کسی آیت کے اس وقت کے معنی، حکم کو اپنے عمل سے نسخ کر سکتا ہے۔“ یہی حال اُوز ترک صاحب نے علامہ ماتریدی کے ایک اور جملے کے ساتھ کیا ہے: [10] ’فيه دليل على أن الكتاب يجوز أن ينسخ حكمه بترك الناس العمل‘۔[11] حالاں کہ اس بات کو انھوں نے یوں واضح کیا ہے: ’وهذا وأمثاله في حكم عرف ثبوته على الخصوص لمعنى، ثم ينعدم المعنى، وما لا يعقل معناه يجب العمل بالكتاب ولا يترك بترك الناس‘۔[12] یعنی یہ اور اس جیسے سب حکم لوگوں کے ترک عمل سے نسخ اس صورت میں ہوں گے، جب وہ حکم کسی معنی (علت و مقصد) کے لیے ہو، اور پھر وہ معنی معدوم ہو جائے۔ البتہ جس کا معنی ہی معلوم نہ ہو، تو وہ حکم لوگوں کے ترک سے ختم نہیں ہو گا۔ غرض یہ کہ یہ بھی وہی بات ہے، جو ہم نے عرض کی ہے۔ خود اُوز ترک صاحب نے اپنے بیانات میں علت وغیرہ کا ذکر کیا ہے، مگر پھر تاریخیت کی چڑیا معلوم نہیں کہاں سے پکڑ لاتے ہیں؟ مثلاً اس سہ ماہی ”تدبر“ کے صفحہ ۱۳۶ میں ہے: ”اس آیت کریمہ کی بنیاد، سبب بننے والی علت کے اٹھ جانے کی وجہ سے عمل کے نسخ ہونے پر دلیل موجود ہے“۔ لیکن اس کا نتیجہ تاریخیت کیسے ہوتا ہے، وہ بس شاید اللہ ہی جانتا ہے۔

دیکھیے اس تاریخیت سے کیا مبلغ فہم بر آمد ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

”میں قرآن کی بالائے تاریخ تاویل کو نامناسب سمجھتا ہوں۔ اسے عملی زندگی میں کسی طور مفید ہوتا نہیں دیکھ رہا اور مجھے یہ جاننے کا بہت تجسس ہے کہ یہ علما کیسے اپنے رویے اپناتے ہیں۔ کیا یہ لوگ ملاعنہ، ظہار الایلاء یا پھر مندرجہ بالا تین اوقات مخصوصہ میں قائم حرمت کا پاس کرتے ہیں؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر قرآن میں اترے تمام احکام ابدی ہیں تو یہ ایسا سب کچھ کیوں نہیں کرتے؟ میں تو تاریخی حیثیت کی رو سے چلتا ہوں، لہٰذا میرے لیے یہ مسئلہ نہیں ہے۔ مگر کیا موجود حاضرین میں سے کسی کو افسوس نہیں ہوتا کہ عمر پوری گزر گئی، کبھی اپنی بیگم کو ایلاء یا ظہار نہیں کر پایا![13]“

۱۰۔ سہ ماہی تدبر، لاہور، شمارہ ۹۹، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۱۳۶۔

۱۱۔ تفسیر الماتریدی (تاویلات اہل السنۃ) ۶۲۳/۹۔ ”اس میں یہ دلیل ہے کہ قرآن کے حکم کا نسخ لوگوں کے ترک عمل کی وجہ سے ممکن ہے۔“

۱۲۔ تفسیر الماتریدی (تاویلات اہل السنۃ) ۶۲۴/۹۔

۱۳۔ سہ ماہی تدبر، لاہور، شمارہ ۹۹، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۱۳۶۔

کیا مضحکہ خیز استدلال ہے! کیا یہ تجاہل ہے یا کچھ اور؟ یعنی ایلا ایک بری چیز تھی، جو اگر کوئی کر لے تو اسے کچھ ہدایات دی گئی ہیں، نہ کہ وہ کوئی کرنے کا کام تھا۔ کیا سب صحابہ نے ایلا و ظہار کیا تھا؟ کیا ان کو بھی تاریخیت نے روکا تھا؟ کیا ان کے زمانے میں بھی ایلا تاریخیت کی وجہ سے معطل ہوا تھا؟ بلا سوچے سمجھے ایک مقدمہ قائم کیا گیا اور اس سے شریعت کو منسوخ کرنے کی ایک ناروا کوشش کی گئی ہے۔ آج بھی کوئی اپنی بیوی سے ترک تعلق کی قسم کھا لیتا ہے تو اس پر یہ حکم عائد ہو جائے گا۔ ہم نے اوپر یہ واضح کر دیا ہے کہ کسی حکم کے تعطل یا موقوف ہونے کی وجہ اس حکم سے متعلق تمام موجبات میں سے کسی ایک کا فقدان ہے، نہ کہ عمرانیات یا تاریخیت ہے۔ یہ فقدان نزول قرآن کے وقت بھی ہو تو حکم عارضی طور معطل یا موقوف ہو جائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ منسوخ ہو جائے گا۔

مضحکہ خیز مثالیں، اس تحریر میں اور بھی ہیں، مثلاً حرام مہینے، جنت میں سونے کے کنگن اور نہریں وغیرہ۔ ان تمام مثالوں میں بھی وہ عمرانیات کو لاتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ”اب تم مرد ہوتے ہوئے ریشم کے کپڑے پہنو اور اپنی کلائیوں میں سونے چاندی کی چوڑیاں کنگن وغیرہ پہنو، پھر نکلو گلیوں بازاروں میں، دیکھنا لوگ کیسا سمجھیں گے تمھیں![141]“؟ بلاشبہ، آج تو شاید لوگوں کی اکثریت کنگن پہننے کو پسند نہ کرے، شاید صحابہ میں سے بھی بے شمار لوگ اس زندگی میں کنگن پسند نہیں کرتے رہے ہوں، لیکن یہ کیسے پتا چلا کہ مصطفیٰ صاحب یا ان کے ہم وطن جنت میں بھی کنگن پسند نہیں کریں گے؟ کیونکہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ دنیا میں کنگن پہنائے جائیں گے۔ رہا قرآن میں ان کا ذکر تو سب سمجھتے ہیں کہ ان آیات کا مطلب جنت کی زندگی کا بیان ہے۔ اس میں کوئی تاریخیت یا عمرانیات شامل نہیں ہے۔ یعنی اگر اللہ نے مصطفیٰ صاحب کو جنت میں جانے کی صورت میں شاہی کنگن ہی پہنانے ہیں تو یہ بیان تاریخیت کی زد میں کیسے آئے گا؟ یہ تو عین بیان حقیقت ہوگا۔

خلاصہ

تاریخیت یا عمرانیات حکم کے نسخ و تعطل میں کوئی دخل نہیں رکھتے۔ یہ صرف موجبات عمل ہیں، جن کے فقدان سے حکم موقوف ہو جاتا ہے اور جب وہ موجود ہوں تو حکم بحال ہو جاتا ہے۔ یہ عمل کسی تاریخی عمل سے گزرے بغیر عہد رسالت میں بھی ہوا ہے، جس کی ہم نے مثالیں دے دی ہیں۔ نسخ احکام میں عمرانیات یا تاریخیت

۱۴۱۔ سہ ماہی تدبر، ص ۱۳۹۔

کی بیخ بے محل اور بلاوجہ لگا دی گئی ہے، دین میں اس کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ تاریخیت دین کو ایک سطحی طریقے سے دیکھنے کا نام ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاریخیت اور عمرانیات نہ حکم الٰہی کے ناسخ ہیں اور نہ اس کے وجوب میں پیش نظر۔

بلکہ قرآن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں دیے گئے احکام ابدی حکمت کے تحت دیے گئے ہیں، جو موجبات کے تحت واجب ہوتے اور موجبات کے فقدان پر موقوف ہو جاتے ہیں۔ ہماری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ بالغ مجنون پر شرائع عائد نہیں ہوتے، اس لیے کہ وہ استطاعت نہیں رکھتا۔ غشی اور بے ہوشی میں بھی یہی ہوتا ہے۔ مکلف جب حالت تکلیف میں نہیں رہا تو حکم اس کے لیے موقوف ہو گیا۔

ایسی ہی صورت تمام تعبدی اور غیر تعبدی امور میں ہے۔ جب موجبات حکم پورے موجود ہوں گے، حکم عمل میں آ جائے گا اور جب موجبات پورے نہیں ہوں گے، حکم موقوف ہو جائے گا۔ ان موجبات میں سے ایک چیز علت یا معنی ہیں۔ لیکن علت کے علاوہ بھی موجبات ہیں، جن میں سے چند ہم نے اوپر بیان کر دیے ہیں۔ مثلاً تین وقت اجازت کے موجبات یہ بیان کیے گئے ہیں:

تین وقت اجازت کے موجبات						
مکلف	استطاعت	وجۂ حکم	علت	ذریعہ	وقت	حکم
گھر کے افراد	اندر آ سکنا	دروازہ نہ ہونا	بے پردگی	مسکونہ گھر	تین اوقاتِ بے لباسی	اجازت لینا

ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو حکم موقوف ہو جائے گا۔ تاریخیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اللّٰھُمَّ أرنا الحق حقًا وارزقنا إتباعه وأرنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه۔

محمد وسیم اختر مفتی

السابقون الاولون من الانصار

(٦)

[”سیر و سوانح“ کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت معاذ بن عفرا رضی اللہ عنہ

نسب

حضرت معاذ بن عفرا اپنی والدہ حضرت عفرا بنت عبید کی نسبت سے مشہور ہیں۔ ان کے والد کا نام حارث بن رفاعہ تھا۔ دونوں کا تعلق یثرب کے قبیلے خزرج کی شاخ بنو نجار سے تھا۔ مالک بن نجار حضرت معاذ کے ساتویں، خزرج بن حارثہ گیارھویں اور ازد بن غوث انیسویں جد تھے۔ حضرت معاذ خزرجی اور انصاری کی نسبتوں سے جانے جاتے ہیں۔

والدہ کا ازدواجی سفر

حضرت عفرا بنت عبید کی شادی حارث بن رفاعہ سے ہوئی تھی، لیکن حضرت معاذ اور حضرت معوذ کی پیدایش کے بعد ان میں مباینت ہو گئی۔ سفر حج کے دوران میں حضرت عفرا کی ملاقات بنو عدی کے حلیف بکیر

(یاابوالبکیر) بن عبد یالیل سے ہوئی۔ ان میں سلسلۂ ازدواج قائم ہوا تو حضرت عاقل، حضرت عامر، حضرت خالد اور حضرت ایاس نے جنم لیا۔ یہ سلسلہ ٹوٹا تو حضرت عفرا نے مدینہ مراجعت کی۔ تب حارث نے بھی رجوع کیا اور عقد ثانی کے بعد حضرت عوف کی ولادت ہوئی (انساب الاشراف ۲۸۱/۱)۔ حضرت عفرا نے اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لی، لیکن حارث بن رفاعہ کے ایمان لانے کی اطلاع نہیں۔ ابن اسحٰق نے حضرت رفاعہ کو حضرت معاذ کا چوتھا بھائی بتایا ہے (طبقات ابن سعد، رقم ۱۶۳۔ سیر اعلام النبلاء، رقم ۲۷)۔ واقدی کہتے ہیں: یہ بات ثابت نہیں۔ حضرت عفرا نے ۱۴ھ میں وفات پائی۔

ماقبل ہجرت کا ایک واقعہ

ہجرت سے قبل اوس کی شاخ بنو عمرو بن عوف کے سردار سوید بن صامت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے خالہ زاد تھے، حج یا عمرہ کرنے آئے تو آپ نے ان سے ملاقات کی اور اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا: میرے پاس لقمان کا نصیحت نامہ ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ کے پاس ویسا ہی پند نامہ ہو۔ آپ نے ان کا مجلہ سن کر قرآن کی تلاوت فرمائی تو انھوں نے تحسین کی۔ عام خیال ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ سوید یثرب لوٹے تو مشہور روایت کے مطابق حضرت مجذر بن زیاد نے انھیں قتل کر دیا، جس سے اوس و خزرج کے درمیان مشہور جنگ بعاث بھڑک اٹھی۔ ہجرت کے بعد حضرت مجذر ایمان لے آئے اور جنگ بدر میں شرکت کی۔ سوید کا بیٹا حارث بھی پردۂ نفاق میں مسلمان ہو گیا۔ جنگ احد میں اسلامی فوج میں شامل ہوا، لیکن جنگ کے دوران میں حضرت مجذر بن زیاد کو قتل کر کے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور مکہ بھاگ کر مشرکین سے جا ملا۔ بعد میں ایک دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، حارث بن سوید سرخ خون آلود کپڑے پہنے ہوئے مدینہ کے ایک احاطے سے برآمد ہوا۔ آپ نے حضرت عثمان بن عفان کو حکم دیا تو انھوں نے حارث کو قتل کیا۔ ابن اسحٰق کی یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کہ سوید بن صامت کو حضرت مجذر نے نہیں، بلکہ حضرت معاذ بن عفرا نے جنگ بعاث سے پہلے تیر پھینک کر مارا تھا۔

نعمت ایمان اور بیعت النساء

۱۲/ نبوی (جولائی ۶۲۱ء): حضرت معاذ بن عفرا بیعت عقبۂ اولیٰ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرنے والے، انصار کے بارہ 'السابقون الأولون' میں شامل تھے۔ ۱۱/ نبوی میں

حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت عوف بن عفرا، حضرت رافع بن مالک، حضرت قطبہ بن عامر، حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت جابر بن عبداللہ بن رئاب کو نعمت ایمان مل چکی تھی۔ان اصحاب نے یثرب واپس جا کر اسلام کا پیغام اپنے احباب واعزہ تک پہنچایا تو کئی جویاے حق ایمان لے آئے۔ایک سال کے بعد، یعنی ۱۲/ نبوی کے حج میں حضرت جابر بن عبداللہ کے علاوہ ان میں سے پانچ صحابہ دوبارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ان کا ساتھ دیتے ہوئے حسب ذیل سات مزید اہل ایمان نے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا: حضرت معاذ بن عفرا(:ابن اثیر۔حضرت معوذ بن عفرا: ابن جوزی)، حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت یزید بن ثعلبہ، حضرت عباس بن عبادہ، حضرت ابوالہیثم بن تیہان اور حضرت عویم بن ساعدہ۔حضرت ابوالہیثم اور حضرت عویم اوس سے تھے، جب کہ باقی دس صحابہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ عروہ بن زبیر اور زہری نے ۱۱/ نبوی میں ایمان لانے والوں کی تعداد آٹھ بتائی ہے اور حضرت معاذ بن عفرا کو ان میں شامل کیا ہے۔

یہ بارہ 'السابقون الأولون' منیٰ میں کوہ ثبیر کی گھاٹی میں جمرۂ عقبہ کے پاس جمع ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔آپ نے یہ آیت قرآنی تلاوت فرمائی: 'وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ'، ''اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی: اے رب، تو اس کو امن کا شہر بنا دے اور اس میں رہنے والوں کو جو ان میں سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں، ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔فرمایا: جو کفر کریں گے میں انھیں بھی تھوڑا فائدہ دوں گا، پھر انھیں آگ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا،اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے'' (البقرہ ۲: ۱۲۶)اور فرمایا: آؤ،اس بات پر میری بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے،اپنے ہاتھوں پاؤں کے درمیان (اعضاے صنفی سے متعلق) کوئی بہتان نہ تراشو گے اور معروف میں میری نافرمانی نہ کرو گے۔تم میں سے جو عہد پورا کرے گا،اس کا اجر اللہ کے ذمے ہو گا اور جس نے ان میں سے کوئی عہد شکنی کی اور اللہ نے اس کا پردہ رکھا تو اس کا فیصلہ اللہ کرے گا، چاہے سزا دے، چاہے معاف کر دے (بخاری، رقم ۱۸۔احمد، رقم ۲۲۷۵۴۔مسند شاشی، رقم ۱۱۵۰)۔

انصار کے ان بارہ 'السابقون الأولون' کی بیعت ایمان 'بیعت عقبۂ اولیٰ' کہلاتی ہے۔اسے 'بیعت النساء'

بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں جہاد کا ذکر نہیں۔ وجۂ تسمیہ: صلح حدیبیہ کے بعد انھی الفاظ میں عورتوں سے بیعت لی گئی۔

دیگر روایات

حضرت رافع بن مالک بیان کرتے ہیں: میں اور میرا خالہ زاد بھائی معاذ بن عفرا عمرہ کرنے مکہ گئے تو ہماری ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ آپ نے فرمایا: تم پر واجب ہے کہ اپنے رب کی بندگی کرو۔ ہم نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا تو آپ نے ہمیں سورۂ یوسف اور سورۂ علق سکھائیں (طبقات ابن سعد، رقم ۱۶۱۔ البدایۃ والنہایۃ ۳/۳۹۹)۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں: یہ واقعہ سب سے پہلے ایمان لانے والے چھ یا آٹھ انصار کی سبقت الی الایمان سے بھی پہلے پیش آیا، لیکن عام اہل سیر اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت ذکوان بن عبد قیس اور حضرت ابوالہیثم بن تیہان کو پہلے اسلام لانے کا شرف حاصل ہوا۔

بیعت عقبۂ ثانیہ

۱۲/ ذی الحجہ ۱۳/ نبوی (جولائی ۶۲۲ء) کی رات منیٰ کی گھاٹی میں جمرۂ اولیٰ کے مقام پر یثرب کے تہتر مردوں اور دو عورتوں نے اپنے بت پرست ساتھیوں سے چھپ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اسے بیعت عقبۂ ثانیہ کہتے ہیں۔ حضرت معاذ بن عفرا، حضرت معوذ بن عفرا اور حضرت عوف بن عفرا، تین بھائیوں سمیت بنو نجار کے ان انصار نے بیعت میں حصہ لیا: حضرت ابوایوب انصاری، حضرت عمارہ بن حزم، حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت سہل بن عتیک، حضرت اوس بن ثابت، حضرت ابوطلحہ انصاری، حضرت قیس بن ابوصعصہ اور حضرت عمرو بن غزیہ۔

بیعت کرنے والے اصحاب نے آپ کو اور مکہ میں مقیم صحابہ کو یثرب چلنے کی دعوت دی اور عہد کیا کہ ہم لوگ آپ کی حفاظت کے لیے جانیں قربان کر دیں گے۔ اس موقع پر موجود عباس بن عبد المطلب نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان بنی ہاشم میں ہر طرح محترم اور باعزت ہیں۔ اگر آخر تک ان کا ساتھ دے سکتے ہو تو لے جاؤ۔ حضرت براء بن عازب بولے: ہم تلواروں کی گود میں پلے ہیں؛ جس سے آپ جنگ کریں گے، ہم اس سے جنگ کریں گے اور جس سے آپ صلح کریں گے، ہم اس سے صلح کریں گے۔ حضرت ابوالہیثم نے

کہا: کہیں ایسا نہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو آپ ہمیں چھوڑ کر مکہ واپس آ جائیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: تم اطمینان رکھو، میرا جینا مرنا تمھارے ساتھ ہے۔ میں تمھارا ہوں اور تم میرے ہو۔ حضرت اسعد بن زرارہ نے اپنے ساتھیوں کو متنبہ کیا: یہ بیعت عرب و عجم کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔ انصار نے پر جوش لہجے میں جواب دیا: ہاں، ہاں، ہم لوگ اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔

بیعت الحرب

۱۲؍ نبوی کا سال گزرنے کے بعد اسلامی ریاست کے آثار نظر آنے لگے تو نصرت دین اور اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ضروری ہو گیا۔ چنانچہ بیعت عقبۂ ثانیہ میں جہاد اور مملکت اسلامیہ کے دفاع کی شقیں شامل کی گئیں، اس لیے اسے 'بیعت الحرب' کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیات تلاوت فرمائیں، اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور اسلام کی طرف رغبت دلائی۔ انصار نے سوال کیا: یا رسول اللہ، ہم کس امر پر آپ کی بیعت کریں؟ تو آپ نے فرمایا: مستعدی اور کسل مندی میں سمع و طاعت کی، تنگی اور کشادگی میں انفاق کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی، اس بات کی کہ تم اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہو گے، اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرو گے، میری نصرت کرو گے جب میں تمھارے پاس آؤں گا، میرا دفاع کرو گے ان معاملات میں جن میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا دفاع کرتے ہو، بدلے میں تمھیں جنت ملے گی (احمد، رقم ۱۴۴۵۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۲۵۱۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۳۵۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۵۵۲۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۰۱۲)۔

مواخات

ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس بن مالک کے گھر پینتالیس مہاجرین اور پینتالیس انصار میں رشتۂ مواخات قائم کیا تو حضرت معاذ بن عفرا کو بدری صحابی حضرت معمر بن حارث جمحی کا انصاری بھائی قرار فرمایا۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت عمر بن خطاب حضرت معاذ بن عفرا کے مہاجر بھائی قرار پائے (طبقات ابن سعد، رقم ۵۶)۔

مسجد نبوی کی تعمیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے اپنے دو یتیم

بھتیجوں (ذہبی) حضرت سہل بن عمرو اور حضرت سہیل بن عمرو کے کھجوریں خشک کرنے والے باڑے یا کھلیان میں مسجد بنائی تھی۔ اس میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پانچوں نمازیں اور جمعہ پڑھا یا جاتا تھا۔ ابن ہشام، طبری اور ابن کثیر کہتے ہیں: حضرت سہل اور حضرت سہیل حضرت معاذ بن عفرا کی کفالت میں تھے، جب کہ امام بخاری نے انھیں حضرت اسعد بن زرارہ کے زیر کفالت بتایا ہے (بخاری، رقم ۳۹۰۶)۔

غزوۂ بدر

جمعہ ۱۷/ رمضان ۲ھ (۱۳/ مارچ ۶۲۴ء): جنگ بدر کے دن تین سو تیرہ مسلمان دو گھوڑوں، ستر اونٹوں، چھ زرہوں اور آٹھ تلواروں کے ساتھ میدان کارزار میں اترے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی اور حضرت مرثد نے باری باری ایک اونٹ پر سفر کیا، جب کہ حضرت معاذ، حضرت معوذ، حضرت عوف، تینوں بھائی اور ان کے غلام ابو الحمرا ایک اونٹ پر سواری کرتے ہوئے میدان بدر پہنچے۔ کفار کا لشکر ساڑھے نو سو فوجیوں پر مشتمل تھا، سو گھوڑے، سات سو اونٹ، چھ سو زرہیں اور لاتعداد تلواریں اور بھالے ان کی حربی طاقت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی رات اپنے رب کے حضور عجز و نیاز میں گزاری اور دعا فرمائی: یارب، اپنا وعدہ سچ فرما، اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو روے زمین پر تیری عبادت نہ کی جائے گی (مسلم، رقم ۴۶۰۹)۔ اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا: 'اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ'، ''میں تمھیں کمک پہنچاؤں گا ایک ہزار فرشتوں کی، پے در پے'' (الانفال ۸: ۹)۔ عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو منافق ساتھیوں کو لے کر واپس ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تسلی دی: 'اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ'، ''کیا تمھارے لیے کافی نہیں کہ تمھارا پروردگار تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں سے تمھاری مدد کرے'' (آل عمران ۳: ۱۲۴)۔ اللہ نے صبر اور تقویٰ کی شرط لگاتے ہوئے تین ہزار کے بجاے پانچ ہزار کا وعدہ فرمایا: 'بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ'، ''ہاں، کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور کافر تم پر دفعتاً آدھمکیں تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو اپنے خاص نشان لگائے ہوں گے'' (آل عمران ۳: ۱۲۵)۔ مسلمان اس قدر دلیری سے لڑے کہ کفار کی فوج کو عبرت ناک شکست ہوئی، ستر کفار جہنم واصل ہوئے اور ستر اسیر ہوئے، جب کہ چودہ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ حضرت معاذ بن عفرا اور ان کے بھائیوں حضرت معوذ بن عفرا،

حضرت عوف بن عفرا اور شاذ روایت کے مطابق حضرت رفاعہ بن عفرا نے جنگ بدر میں بھرپور شرکت کی۔

مکہ کے ایسے درجنوں رہنما ہلاک ہوئے جن کی انتظامی اور تجارتی مہارت کا کوئی بدل نہ تھا۔ قریش کی شام کی تجارتی شاہراہ غیر محفوظ ہو گئی۔ سب سے بڑھ کر ان کی عزت و وقار کو نقصان پہنچا۔ بدنامی سے بچنے کے لیے اہل مکہ نے فیصلہ کیا کہ اس شکست پر خاموش سوگ منایا جائے گا اور کوئی بھی اپنے مقتولین کی یاد میں گریہ و نوحہ پر مشتمل اشعار نہ کہے گا۔ مسلمانوں کے اعتماد میں اضافہ ہوا کہ وہ حق پر ہیں اور ان کا مذہب برتر ہے، یوں مدینے کی ریاست مستحکم ہوئی۔ اس فتح نے مدینے میں بسنے والے یہودیوں کو بھی مرعوب کر دیا۔ قرآن مجید میں اس غزوہ کو یوم الفرقان، یعنی فیصلے کے دن کا نام دیا گیا۔

روبرو مقابلے

اس زمانے کے دستور کے مطابق روبرو مقابلوں (duels) سے جنگ کا آغاز ہوا۔ مشرک سردار عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور بیٹے ولید بن عتبہ کو لے کر نکلا اور دعوت مبارزت دی۔ اس کے للکارنے پر تین انصاری جوان حضرت عوف بن عفرا، حضرت معوذ بن عفرا اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ آگے آئے (ابن اثیر)۔ واقدی کہتے ہیں: ہمارے نزدیک ثابت ہے کہ یہ تینوں عفرا کے بیٹے معاذ، معوذ اور عوف تھے (کتاب المغازی ۱/۶۸)۔ مبارزین نے پوچھا: تم کون ہو؟ انھوں نے جواب دیا: ہمارا تعلق انصار سے ہے۔ بولے: ہمیں تم سے کچھ نہیں لینا دینا۔ ہم نے اپنے چچیروں سے مقابلہ کرنا ہے۔ محمد، ہماری قوم کے ہم پلہ اصحاب شرف بھیجو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری جوانوں کو واپس جانے کو کہا اور فرمایا: اے بنی ہاشم، اٹھ کر مقابلہ کرو، اٹھو حمزہ، اٹھو عبیدہ بن حارث، اٹھو علی۔ تینوں نکل کر آئے تو عتبہ بولا: اب برابر کے، صاحب شرف لوگوں سے جوڑ پڑا ہے۔ ولید بن عتبہ کا حضرت علی سے، شیبہ بن ربیعہ کا حضرت حمزہ سے اور عتبہ بن ربیعہ کا حضرت عبیدہ بن حارث سے مقابلہ ہوا۔ دو بدو مقابلوں (duels) میں تینوں مشرک جہنم واصل ہوئے، جب کہ حضرت عبیدہ بن حارث کا پاؤں کٹ گیا۔ ان کی شہادت اسی زخم سے ہوئی۔

حضرت معاذ بن عفرا کی دلیری

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف بیان کرتے ہیں: جنگ بدر میں، میں ایک صف میں کھڑا تھا۔ میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو انصار کے دو نو عمر لڑکے نظر آئے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں ان سے زیادہ

مضبوط پسلیوں والوں کے بیچ میں ہوتا۔ تبھی ایک نے اشارہ کر کے مجھے بلایا اور پوچھا: چچا، آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں، لیکن بھتیجے، تمھیں اس سے کیا کام ہے؟ بولا: مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے اس کو دیکھ لیا تو اس کے جسم کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا، جب تک ہم میں سے جس کی قسمت میں پہلے مرنا لکھا ہو، مر نہ جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں: میں اس کی بات سے بہت متاثر ہوا۔ پھر دوسرے نوجوان نے اشارہ کر کے مجھے مخاطب کیا اور ایسی ہی گفتگو کی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ میں نے ابوجہل کو لوگوں میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ میں پکارا: سنو لڑکو، یہ ہے تمھارا آدمی جس کے بارے میں تم نے پوچھا تھا۔ دونوں تلواریں لے کر اس کی طرف لپکے اور اسے قتل کر ڈالا۔ پھر وہ دونوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو بتلایا۔ آپ نے سوال فرمایا: تم دونوں میں سے کس نے اسے مارا ہے؟ دونوں نے کہا: میں نے اسے قتل کیا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنی تلواریں پونچھ لی ہیں؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے ان کی تلواروں کا ملاحظہ کیا اور تصدیق فرمائی کہ تم دونوں ہی نے اس کی جان لی ہے۔ البتہ اس کا چھوڑا ہوا سامان حرب معاذ بن عمرو بن جموح کو ملے گا۔ وہ دونوں نوجوان حضرت معاذ بن عفرا اور حضرت معاذ بن عمرو بن جموح تھے۔ بخاری کی روایت ۳۹۸۸ میں ہے: وہ دونوں عفرا کے بیٹے تھے (بخاری، رقم ۳۱۴۱۔ مسلم، رقم ۴۵۹۰۔ احمد، رقم ۱۶۷۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۷۹۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۸۴۰۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۸۶۷)۔

ابن حجر کہتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن عمرو بن جموح کو غنیمت کا حق دار قرار دیا، کیونکہ انھوں نے پہلے وار کیا اور زیادہ گہری چوٹ لگائی۔ تمام قاتلوں کے غنیمت میں شریک ہونے کا حکم غزوۂ بدر کے سات سال بعد جنگ حنین میں ارشاد ہوا (فتح الباری: شرح حدیث، رقم ۳۱۴۱۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۸۴۰)۔

ابوجہل کا انجام

حضرت انس بن مالک کی روایت ہے: (جنگ بدر کے دن) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کون معلوم کرے گا کہ ابوجہل کا کیا حشر ہوا؟ (آپ کے حکم پر) حضرت عبداللہ بن مسعود نکلے، انھوں نے دیکھا کہ عفرا کے بیٹوں معاذ اور معوذ نے اسے ادھ موا کر دیا ہے اور اس کا جسم ٹھنڈا پڑا ہے۔ انھوں نے پوچھا: کیا تو ہی ابوجہل ہے؟ پھر اس کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ ابوجہل بولا: کیا اس شخص، (یعنی مجھ) سے بڑا بھی کوئی ہے جسے اس کی قوم نے مار ڈالا ہے؟ (بخاری، رقم ۳۹۶۲)۔ حضرت انس ہی کی دوسری روایت میں ہے: ابوجہل نے

(حقارت سے) کہا: کاش! ایک مزارع کے علاوہ کسی نے مجھے قتل کیا ہوتا (بخاری، رقم ۴۰۲۰)۔اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوجہل کے دماغ میں مرتے دم تک اپنی سرداری سمائی ہوئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: میں نے ابوجہل کا سر کاٹا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لا کر کہا: یہ اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے (طبری ۲/ ۳۷)۔ حضرت عبداللہ ابوجہل کی تلوار اور زرہ وغیرہ بھی لے آئے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عطا کر دیں (الاستیعاب، رقم ۱۴۰۹)۔

حضرت معاذ بن عفرا اور ان کے دو سگے اور چار سوتیلے بھائیوں نے غزوۂ فرقان میں حصہ لیا۔ان میں سے تین نے جان کا نذرانہ دے کر جنت میں مقام بنا لیا۔یہ شرف کسی دوسرے اسلامی کنبے کو حاصل نہ ہوا۔آٹھ شہداے انصار میں ان کے دو سگے بھائی حضرت معوذ بن عفرا اور حضرت عوف بن عفرا اور چھ مہاجرین شہدا میں ان کے سوتیلے بھائی حضرت عاقل بن بکیر شامل تھے۔

امیہ بن خلف کو مشہور روایت کے مطابق حضرت بلال اور حضرت خبیب بن یساف نے مل کر اور ایک روایت کے مطابق حضرت رفاعہ بن رافع نے قتل کیا (کتاب المغازی، واقدی ۱/ ۱۵۱)۔ایک اور شاذ روایت کے مطابق امیہ بن خلف کو حضرت معاذ بن عفرا، حضرت خارجہ بن زید اور حضرت خبیب بن اساف نے مل کر قتل کیا (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۲/ ۲۷۰)۔

دیگر غزوات

حضرت معاذ بن عفرا نے جنگ احد، جنگ خندق اور باقی غزوات میں بھرپور حصہ لیا۔

وادی القریٰ کی غنیمت

وادی القریٰ، یعنی کئی بستیوں کی وادی، مدینہ سے شام کو جانے والے راستے پر تیما اور خیبر کے درمیان واقع ہے۔موجودہ سعودی عرب میں اسے العلا کے نام سے جانا جاتا ہے، جو صوبۂ مدینہ میں واقع ہے۔یہ اپنی سرسبزی و شادابی کے لیے ضرب المثل ہے۔یہاں قوم ثمود آباد تھی، جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث کیے گئے تھے۔اس قوم کے کافروں نے اللہ کی مقررہ نشانی، اونٹنی کو ہلاک کر دیا تو انھیں چنگھاڑ اور زلزلے سے تباہ کر دیا گیا۔ ثمود کی تباہی کے بعد یہاں یہود، قضاعہ، جہینہ اور عذرہ کے قبائل آباد ہوئے۔انھوں نے زراعت کو دوبارہ ترقی دی۔

۷ھ: جنگ خیبر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی القریٰ آئے اور یہاں کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی، لیکن یہود آمادہ بہ جنگ ہوئے۔ دو دن کی لڑائی کے بعد فتح نصیب ہوئی، مال پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا، لیکن اراضی یہودیوں کے پاس رہنے دی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں تمام یہودیوں کو ان کی عہد شکنی کی بنا پر مدینہ سے جلاوطن کیا، پھر انھیں حجاز سے بے دخل کرنے کا حکم دیا (بخاری، رقم ۳۱۶۷، ۴۰۲۸۔ مسلم، رقم ۴۶۱۳، ۴۶۱۴)۔ عہد فاروقی میں جب خیبر کے یہودیوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر کا کلائی کا جوڑ اتار دیا تو حضرت عمر نے یہ کہہ کر کہ عہد نبوی میں حضرت عبد اللہ بن سہل انصاری کو شہید بھی تم نے کیا تھا، انھیں خیبر سے نکال باہر کیا۔ بلاذری کی روایت ہے کہ اس وقت انھوں نے وادی القریٰ کے یہودیوں کو بھی جلاوطن کر دیا تھا۔

حضرت عمر فاروق نے وادی القریٰ کی اراضی حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت عبد اللہ بن ارقم، حضرت معاذ بن عفرا، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو طلحہ، حضرت جابر بن عبد اللہ بن رئاب، حضرت محمد بن مسلمہ اور بائیس دیگر صحابہ میں تقسیم کر دی۔

شہادت

حضرت معاذ بن عفرا نے ۴۰ھ میں عہد علوی میں وفات پائی (الکامل ۲/ ۷۵۴)۔ ابن اثیر کہتے ہیں: ان کی وفات اس وقت ہوئی جب صفین میں حضرت علی و حضرت معاویہ کے مابین جنگ جاری تھی (اسد الغابۃ ۴/ ۳۷۹)۔ "اسد الغابہ" کے مترجم نے لکھا ہے کہ حضرت معاذ نے معاویہ علی کشمکش میں حضرت علی کا ساتھ دیا اور ان کی شہادت جنگ صفین میں ہوئی۔ یہ بات ابن اثیر کی عربی عبارت میں موجود نہیں۔ ایک شاذ روایت کے مطابق حضرت معاذ بن عفرا ۶۳ھ میں واقعۂ حرہ میں شہید ہوئے۔ سانحۂ کربلا کے بعد اہل مدینہ نے یزید کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو اس نے مدینہ پر چڑھائی کے لیے مسلم بن عقبہ کی سربراہی میں بارہ ہزار کا لشکر بھیجا۔ اہل مدینہ نے حضرت عبد اللہ بن حنظلہ کی قیادت میں مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ حرہ کی اس جنگ میں حضرت عبد اللہ بن جعفر، حضرت عبد اللہ بن نوفل اور متعدد صحابہ کے بیٹے شہید ہوئے۔

حضرت ربیع بنت معوذ بتاتی ہیں: ان کے چچا حضرت معاذ بن عفرا نے انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ کرنے کے لیے تر و تازہ کھجوروں سے بھرا تھال دیا، جس پر ککڑیوں کی باریک اور نرم قاشیں ڈالی گئی تھیں۔ آپ

کو ککڑیاں بہت پسند تھیں، آپ نے انھیں مٹھی بھر کر سونا یا پہننے کے لیے ایک ہار عطا کیا، جو شاہ بحرین نے آپ کو تحفے میں بھیجا تھا (احمد، رقم ۲۷۰۲۳۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۲۰۱۵۷، ۲۰۱۶۰)۔ ابن اثیر نے چھ سال بعد کا یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ان مورخین کا رد کیا ہے جو حضرت معاذ کی شہادت غزوۂ بدر میں بتاتے ہیں۔

ازواج و اولاد

اوس کی شاخ بنو ظفر سے تعلق رکھنے والی حضرت حبیبہ بنت قیس سے عبید اللہ پیدا ہوئے۔

بنو نجار کی ام حارث بنت سبرہ سے حارث، عوف، سلمٰی اور رملہ نے جنم لیا۔

جہینہ کی ام عبد اللہ بنت نمیر سے ابراہیم اور عائشہ کی ولادت ہوئی۔

بنو نجار کی ام ثابت رملہ بنت حارث سے سارہ کی ولادت ہوئی۔

روایت حدیث

معاذ قرشی (معاذ بن حارث) بتاتے ہیں: حضرت معاذ بن عفرا نے فجر یا عصر کے بعد بیت اللہ کا طواف کیا اور دو مسنون نوافل نہ پڑھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: دو نمازوں کے بعد کوئی نفلی نماز نہیں پڑھی جا سکتی، فجر کے بعد، حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے، عصر کے بعد یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے (ترمذی، رقم ۱۸۳۔ نسائی، رقم ۵۱۹۔ احمد، رقم ۱۷۹۲۶۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۷۳۹۹)۔

مطالعۂ مزید: کتاب المغازی (واقدی)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، انساب الاشراف (بلاذری)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، Wikipedia۔

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

تفسیر ''مفتاح القرآن'' کا ایک علمی مطالعہ

(۴)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

تحویل قبلہ کی بحث

مسلمانوں میں عام پھیلی ہوئی بات یہ ہے کہ بیت المقدس قبلۂ اول رہا ہے اور تحویل قبلہ کے بعد کعبہ کو مستقل قبلہ بنایا گیا، مگر صاحب ''مفتاح القرآن'' کے نزدیک تحویل قبلہ والی روایات کم زور ہیں اور تحویل قبلہ ہوا ہی نہیں، بلکہ کعبۃ اللہ ہی ہمیشہ قبلہ رہا ہے۔ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ تحویل قبلہ کی روایات حضرت براء بن عازب سے مروی ہیں جو سب روایت و درایت کے اعتبار سے کم زور ہیں۔[۳۶]

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ یا مدینہ، دونوں جگہ ہمیشہ بیت اللہ کی طرف رخ کرکے ہی نماز پڑھی ہے۔ بعض انصاری صحابہ نے، البتہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز ضرور پڑھی ہے، اور اسی وجہ سے یہ تحویل قبلہ والی بات مشہور ہوگئی ہے۔

۳۔ بیت المقدس تو خود کعبہ رخ ہے، اسی طرح قدیم مسجدیں —— مسجد صخرہ، مسجد نوح اور مسجد صالح

۳۶؎ واضح رہے کہ تفسیر میں انھوں نے تمام روایات کا ایک ایک کرکے جائزہ لیا ہے۔

—— سب قبلہ رخ ہیں، پھر بیت المقدس کو قبلۂ اول کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

۴۔ 'فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا' (البقرہ ۲: ۱۴۴) کا عام ترجمہ کہ ہم تمھارا رخ تمھارے پسندیدہ قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، غلط ہے، کیونکہ 'وَلّٰی یولّی تولیة' بغیر صلہ کے استعمال ہو تو اس کا معنی والی بنانا ہوتا ہے، پھیرنے کے معنی میں اس کا استعمال 'الی' کے صلہ کے ساتھ کرتے ہیں۔اس لیے صحیح ترجمہ ہوگا: ہم تم کو تمھارے پسندیدہ قبلہ کا والی بنا دیں گے۔اسی طرح 'قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ' (البقرہ ۲: ۱۴۴) کا ترجمہ یہ کرنا کہ ''ہم آپ کا بار بار آسمان کی طرف رخ کرنا دیکھ رہے ہیں'' اس لیے صحیح نہیں کہ یہ 'تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ' کا ترجمہ ہے۔اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے ''ہم آسمان میں آپ کی بے چینی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔یعنی تقلبِ وجہ کنایہ ہے بے چینی واضطراب سے۔

۵۔قدیم مفسرین و علما میں ابو مسلم اصفہانی اور امام ابو العالیہ ریاحی بھی اسی کے قائل تھے کہ قبلہ ہمیشہ کعبۃ اللہ رہا ہے۔

۶۔ تحویل قبلہ ہوا ہوتا تو اس کے بعد مسجد نبوی اور مسجد قبا میں تعمیری تغیرات کیے جاتے جو ضرور منقول ہوتے، کیونکہ مسجد نبوی کے تمام تعمیری تغیرات تواتر سے منقول ہوتے آرہے ہیں۔ تحویل قبلہ کی یہ بحث تفسیر میں تقریباً ۲۰ صفحات میں آئی ہے اور اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔[۳۷]

منفرد ترجمۂ آیات

متعدد آیات کے ترجمہ میں بھی مفسر گرامی نے الگ ہی راہ اپنائی ہے۔مثال کے طور پر 'لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا' (المائدہ ۵: ۴۸) کا ترجمہ یوں کیا ہے: (اے لوگو) تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک ہی گھاٹ اور ایک ہی سڑک کا تقرر کر دیا ہے۔[۳۸] دوسرے مفسرین و علما یہ کہتے ہیں کہ اس میں ہر قوم کے لیے الگ مذہب و طریقہ کا بیان ہے۔جو ظاہر ہے کہ نصوص شریعت سے متصادم ہے۔اسی طرح اور بہت ساری آیات ہیں، جن کا ترجمہ مصنف علام نے دوسرے مترجمین و مفسرین سے الگ کیا ہے۔

قرآن پورا محکم ہے متشابہ گذشتہ کتابیں ہیں

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ قرآن میں دو قسم کی آیتیں ہیں: محکم و متشابہ۔پھر محکم و متشابہ کی الگ الگ تشریح

۳۷۔ ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن ۱/ ۲۹۳-۳۰۸، طبع ثانی۔

۳۸۔ مراد ہے قرآن و سنت، مصنف مقالہ۔

کی جاتی ہے اور اس بارے میں مبنیٰ سورۂ آل عمران (۳) کی ساتویں آیت 'هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ' کو بنایا جاتا ہے، مگر علامہ میرٹھی اس عمومی رائے سے اتفاق نہیں کرتے؛ وہ کہتے ہیں کہ قرآن تو پورا محکم ہے، جیسا کہ خود قرآن ہی میں کئی جگہ فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ ہے: 'كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ' (ہود ۱۱: ۱): الف لام را ایک حکمت والی باخبر ہستی کے پاس سے آئی ہوئی کتاب جس کی آیتوں کو پختہ کیا گیا ہے، پھر الگ الگ (سلسلۂ بیان میں) ٹانکا گیا ہے۔ جب اس کی آیات محکم ہیں تو پھر متشابہ کا سوال کہاں اٹھتا ہے۔ اس لیے ان کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم تو پورا محکم ہے، بقیہ صحف سماویہ متشابہ ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت 'هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ، وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ' کا ترجمہ وہ یوں کرتے ہیں: وہی ہے جس نے (اے نبی) تجھ پر اپنی طرف سے کتاب نازل فرمائی ہے، وہ محکم آیتیں ہیں جو خدائی کتابوں کی جامع و مرکز ہیں اور دیگر کتابیں، یعنی بائیبل کے صحیفے حق و باطل آمیز ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق 'هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ' پر وقف کرنا چاہیے اور 'وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ' کو الگ فقرہ کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔[۳۹]

تورات وانجیل تاریخی طور پر معتبر نہیں

سورۂ آل عمران میں 'وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ' کی تفسیر میں تورات وانجیل، دونوں کی استنادی حیثیت پر طویل گفتگو خود بائیبل اور ''انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا'' کے حوالہ سے کی ہے۔[۴۰]

'هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ' کی صحیح تفسیر

سورۂ انعام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں اس سلسلۂ آیات میں کئی جگہ 'هٰذَا رَبِّيْ' آیا ہے، جس کو عام طور پر مفسرین حضرت ابراہیم کا قول مان لیتے ہیں اور اس پر ہونے والے اعتراض کہ ایسا شرکیہ جملہ کسی نبی سے کیسے صادر ہو سکتا ہے، کی دور از کار تاویلیں کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے اس بات کو حضرت ابراہیم کا اس وقت کا قول بتادیا ہے جب وہ تلاش حق کے دور سے گزر رہے تھے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا انبیا اس دور سے

۳۹؎ ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن ۱/ ۵۸۹، طبع ثانی۔

۴۰؎ ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن ۱/ ۵۹۰، طبع ثانی۔

گزرا کرتے ہیں؟ ان کو تو زندگی کے ہر دور میں حق تعالیٰ کی نگرانی و معیت حاصل رہتی ہے، اگرچہ خود ان کو اس کا شعور نہ ہوتا ہو۔ علامہ میرٹھی نے اس کی تفسیر یوں کی ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ. فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ. فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ. (الانعام ۶: ۷۶-۷۸)

”پس جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے، یعنی آذر نے آسمان پر ایک ستارہ دیکھا، بولا: یہ میرا رب ہے پس جب وہ چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا: میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ پس جب آذر نے چاند کو روشن دیکھا تو بولا: یہ میرا رب ہے میں اس کی عبادت کرتا ہوں، جب وہ چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا: میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میرا رب مجھے راہ راست نہ دکھائے تو یقیناً میں گم راہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا“ اس کے بعد جب آذر نے سورج کو چمکتا دمکتا دیکھا بولا: یہ میرا رب ہے یہ (میرا سب سے) بڑا معبود ہے۔ پس جب وہ چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا: اے میری قوم، بے شک میں تمھارے شرک سے بے زار ہوں (ان چیزوں سے بے زار ہوں جنھیں تم شریک کر رہے ہو۔“

اس کے بعد لکھتے ہیں:

”ان آیات میں فعل ’رأ‘ کا فاعل اور ’ھذا ربی‘ کا قائل حضرت ابراہیم کا باپ آذر ہے جیسا کہ میں نے ترجمہ میں واضح کر دیا ہے، کیونکہ ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آذر کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے۔ اور بادنیٰ تامل ہر قول اپنے قائل کی طرف راجع ہو جاتا ہے۔“

اس کے بعد انھوں نے اس کے نظائر قرآن سے نقل کیے ہیں۔ اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ باپ بیٹے کے درمیان یہ بلیغ مکالمہ اور ڈائیلاگ مختلف اوقات میں اور مختلف جگہوں پر ہوا ہو گا، قیاس کہتا ہے کہ یہ گفتگو زہرہ دیوی، چندرما دیوتا اور سورج دیوتا کے مندروں میں ہوئی ہو گی جن کو ابراہیم کی قوم پوجتی تھی۔[۱۴]

۱۴؎ ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن ۱/ ۳۹۳، طبع ثانی۔

واقعۂ افک

واقعۂ افک کے سلسلہ میں مصنف کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت عائشہ پر الزام کا شوشا روافض کا چھوڑا ہوا ہے، ورنہ منافقین نے تو دراصل تمام مومن عورتوں سے متعلق اسکینڈل پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ آیات کی داخلی شہادت بھی یہی ہے۔ اور جتنی روایات اس سلسلہ میں آئی ہیں (بشمول بخاری کی روایات کے) کوئی بھی علت قادحہ سے خالی نہیں۔ بخاری کی روایات میں متعدد باتیں زہری کی مرسلات میں سے ہیں، جن کی اہل علم کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ ان کا کہنا ہے: 'مرسلات الزهری شبه کا الريح' (زہری کی مرسل روایتیں ہوائی ہوتی ہیں، تہذیب التہذیب) پھر تاریخی طور پر بھی ان روایات میں سقم پایا جاتا ہے۔[۴۲]

خاک سار مقالہ نگار کا خیال یہ ہے کہ روایات بے شک ضعیف و کم زور ہو سکتی ہیں، مگر خود سورۂ نور کی ابتدائی آیات خاص کر آیت ۱۳ 'لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ' کا اشارۃ النص یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کا کوئی بڑا واقعہ ہوا تھا، جس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، کیونکہ کسی عمومی اسکینڈل اور پروپیگنڈے پر چار گواہوں کی طلبی کے کوئی معنی نہیں۔ والعلم عند الله۔

صحف سماوی کا مطالعہ

مفسر گرامی نے دیگر صحف سماویہ بائیبل و توریت کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنی تفسیر میں جا بجا ان کے حوالے بھی دیے ہیں۔ سلیمان و داؤد علیہما السلام کے قرآنی قصہ کا تقابل بائیبل کے بیانات سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرت داؤد و سلیمان علیہ السلام اللہ کے نیک و مقبول بندے اور نبی تھے اور ساتھ ہی بڑی شان و شوکت والے بادشاہ بھی۔ اور ان کی بادشاہی تمام حکمرانوں کے لیے اعلیٰ نمونہ ہے، اللہ کی دی ہوئی قوت کو انھوں نے دین حق کی ترویج و تبلیغ میں ہی صرف کیا تھا، مگر داؤد و سلیمان کا ذکر اسرائیلی کتابوں میں پڑھیے تو ان میں اور دنیا کے دیگر جباروں میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ ملکۂ سبا کا حضرت سلیمان سے ملاقات کے لیے آنا اسرائیلی کتابوں میں بھی مذکور ہے، مگر اس میں غلط اور گندی باتوں کی آمیزش ہے۔ بائیبل کے صحیفہ سلاطین

۴۲؎ واقعۂ افک کی پوری تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر مفتاح القرآن سورۂ نور ۴/ ۵۔ اس مسئلہ پر پاکستان کے حکیم نیاز احمد نے علامہ کی تحقیق سے استفادہ کرکے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی، اگرچہ اپنے ماخذ کا حوالہ انھوں نے نہیں دیا۔

میں یہ قصہ جس طرح لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ سلیمان کی شہرت سن کر مشکل سوالوں سے اسے آزمانے کے لیے آئی۔ سب سوالوں کا جواب باصواب پا کر اور سلیمان کی شان و شوکت ان کے خدام کی تہذیب اور سج دھج دیکھ کر دنگ رہ گئی اور اعتراف کیا کہ میں نے آپ کو جیسا سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ نیز اس نے سلیمان کو ایک سو بیس قنطار سونا، اور الائچی وغیرہ بہت بڑی مقدار میں نذر کیا۔ سلیمان نے بھی جواباً اسے بہت کچھ تحائف سے نوازا۔ پھر وہ اپنے ملازمین سمیت اپنی مملکت کو واپس ہو گئی۔" (سلاطین باب ۱۰)

اس میں نہ ہدہد کا ذکر ہے، نہ ملکہ کی آفتاب پرستی کا، نہ حضرت سلیمان کے خط کا اور نہ ملکہ کے تخت کا۔ اور صحیفۂ ربیون میں یہ سب باتیں تو ہیں، لیکن اس میں توحید و خدا پرستی و شکر حق کی کوئی بات مذکور نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سلیمان نے معاذ اللہ ملکۂ بلقیس سے زنا کیا، اسے حمل رہ گیا۔ اس ناجائز حمل کی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصر پیدا ہوا تھا (جیوش انسائیکلوپیڈیا ۱۱/۴۴۳)۔ اسی کتاب کے صفحہ ۴۳۹-۴۴۱ میں حضرت سلیمان پر احکام تورات کی خلاف ورزی، غرور حکومت، غرور عقل، زن مریدی، عیاشی اور شرک و بت پرستی کے الزامات مذکور ہیں۔ اور بائیبل کی کتاب سلاطین میں لکھا ہے کہ "سلیمان مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا، اس کا دل خدا سے پھر گیا تھا اور وہ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہو گیا"۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعے سے حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کی پاکیزہ سیرت منظر عام پر رکھ دی ہے اور تمام دھبوں کو دھو ڈالا ہے، جو دروغ باف یہودیوں نے ان بزرگوں کی سیرت پر لگائے تھے۔[۴۳]

اس کے علاوہ بھی مفسر گرامی نے اپنی تفسیر میں بائیبل اور قرآن کے بیانات کا جگہ جگہ تقابل کیا ہے۔ مثال کے طور پر قصۂ نوح کا بائیبل کے بیانات سے تقابلی مطالعہ ملاحظہ ہو:

"مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائیبل عہد نامۂ قدیم کے سفر تکوین، یعنی کتاب پیدایش میں یہ قصہ جس طرح آیا ہے ناظرین اسے بھی دیکھ لیں، میں اس کا خلاصہ نقل کر رہا ہوں: روے زمین پر آدمیوں کی کثرت ہوئی اور ان سے بیٹیاں پیدا ہوئیں، خدا کے بیٹوں نے انھیں دیکھا تو ان پر فریفتہ ہو کر انھیں اپنی جورو بنا لیا ان سے بیٹے پیدا ہوئے۔ یہ بڑے جبار و نام ور اشخاص ہوئے، ان میں بدی بہت پھیل گئی تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا اور اسے مٹانے کا پختہ ارادہ کر لیا بجز نوح کے، وہ خدا کو پسند تھا۔"

۴۳؎ علامہ میرٹھی، تفسیر مفتاح القرآن، جلد چہارم، سورۂ نمل آیات ۱۵ تا ۴۴ کی تشریح۔

اس پر ان کا نوٹ ہے:

”دیکھا آپ نے اس بیان کے مطابق قوم نوح کے لوگ انسان نہ تھے، خدا کے بیٹوں اور انسانوں کی بیٹیوں سے پیدا ہوئے تھے۔[۴۴] الخ یہ تقابلی نوٹ کافی طویل ہے اور چار صفحات تک چلا گیا ہے۔“

قصۂ یونس

یونس علیہ السلام کے قصہ میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مدتوں اپنی قوم کو دعوت حق دیتے رہے اور قوم کی سرکشی اور ایمان نہ لانے سے ناراض ہو کر ان کو عذاب کی دھمکی دے کر اور بغیر اذن خداوندی کے ان کے ہاں سے نکل گئے اور ان کے غائبانہ میں قوم پر عذاب آیا، جسے دیکھ کر قوم تائب ہو گئی۔ ادھر حضرت یونس جس کشتی میں سوار ہوئے، وہ نہ چلی اور ڈبکیاں کھانے لگی۔ لوگوں نے کہا کہ کوئی غلام اس پر اپنے آقا سے بھاگ کر آگیا ہے، اس لیے یہ نہیں چل رہی ہے۔ آخر یونس کو کشتی والوں نے دریا میں ڈال دیا اور حکم حق سے مچھلی آپ کو نگل گئی۔ جب مچھلی نے بحکم حق آپ کو کنارہ پر ڈال دیا تو صحت یاب ہو کر وطن واپس آئے اور قوم نے محبت و عقیدت سے استقبال کیا وغیرہ۔ علامہ میرٹھی اس قصہ کو غلط سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ حضرت یونس کے نبی بنائے جانے سے پہلے کا یہ قصہ ہے کہ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر اپنا وطن چھوڑ کر نکل گئے ہوں گے۔ اور کشتی میں بیٹھے ہوں گے، جو زیادہ بوجھ ہو جانے کی وجہ سے ڈبکیاں کھانے لگی ہو گی اور حضرت یونس کا پیر پھسلا ہو گا اور وہ دریا میں جا گرے ہوں گے۔ جہاں ان کو مچھلی نے اللہ کے حکم سے نگل لیا۔ اور اس کے بعد جب مچھلی نے ان کو کنارے پر ڈالا، جہاں وہ کچھ دنوں بعد صحت مند ہوئے ہوں گے تب ان کو نبی بنا کر قوم کے پاس بھیجا گیا ہے، کیونکہ اسی سیاق میں قرآن نے کہا ہے: ’وَاَرۡسَلۡنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلۡفٍ اَوۡ يَزِيۡدُوۡنَ‘ اور ہم نے ان کو ایک لاکھ سے زاید لوگوں کی طرف بھیجا (الصافات ۳۷: ۱۴۷)۔ یعنی مچھلی والی آزمایش سے گزرنے کے بعد۔ مشہور عام قصہ پر نقد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”لیکن حضرت یونس کا قصہ اس انداز میں نہ قرآن میں مذکور ہے نہ کسی صحیح حدیث میں نہ بائیبل میں۔

اور میں اسے بچند وجوہ غلط سمجھتا ہوں، اس لیے کہ:

۱۔ کسی نبی کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اللہ کے حکم کے بغیر قوم کو کوئی بات بتائی ہو۔

---

[۴۴]۔ علامہ میرٹھی، تفسیر مفتاح القرآن ۳/ ۱۱۹۔

ب۔ ہر رسول نے اسی وقت ہجرت کی ہے جب اللہ نے اسے ہجرت کرنے کا حکم دیا، یہ جاننے کے باوجود حضرت یونس اللہ کے اذن کے بغیر ہجرت کیسے کر سکتے تھے؟

ج۔ قرآن کریم میں دو جگہ قوم یونس کے ایمان لے آنے کا ذکر ہے سورۂ یونس میں اور سورۂ صافات میں اور کہیں بھی یہ مذکور نہیں کہ قوم یونس نے اولاً کفر و تکذیب کی روش اختیار کی تھی جیسا کہ اس داستان میں مذکور ہے، نہ قرآن میں نہ حدیث صحیح میں نہ بائیبل میں۔

د۔ مالک کے پاس سے بھاگا ہوا غلام کشتی میں بیٹھ جائے اور وہ نہ چلے یہ نا معقول بات کیسے مان لی جائے؟[۴۵]''

حضرت سلیمان کی وفات

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی وفات کا کوئی پتا نہیں چلا تھا اور وہ جنوں کے ذریعے سے اپنے تعمیری کاموں کی نگرانی کر رہے تھے، تبھی ان پر موت طاری ہو گئی اور جنوں کو اس کا پتا اس وقت چلا جب ان کے عصا کو گھن نے کھا لیا اور وہ گر گئے۔ مصنف نے اس قصہ کا انکار کیا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی موت طبعی طور پر ہوئی تھی۔ وہ بادشاہ تھے، یہ بالکل مستبعد ہے کہ عرصۂ دراز تک عصا کی ٹیک لگا کے وہ کھڑے رہے ہوں اور اس درمیان ان کے حرم اور ان کے دربار میں سے کسی کو پتا نہ چلے! مصنف کے نزدیک 'تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ' سے مراد سلیمان کا بیٹا رجعام ہے جو نالائق تھا اور اس کی نالائقی کے باعث سلیمانی سلطنت کا قصر دھڑام سے گر گیا۔[۴۶]

صرفی و نحوی مباحث

تفسیر ''مفتاح القرآن'' کی ایک خصوصیت جس نے اس تفسیر کو ثقیل اور عام تعلیم یافتہ یا غیر عربی داں لوگوں کے لیے مشکل بنا دیا ہے، وہ صرفی و نحوی مباحث ہیں، جن کا مصنف نے بڑی باریک بینی اور جزرسی کے ساتھ اہتمام کیا ہے۔ اس کا خیال ان کو تھا اور اسی لیے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

۴۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر مفتاح القرآن، جلد چہارم، سورۂ صافات آخری رکوع: 'وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ' کی تشریح۔

۴۶۔ نیز وفات سلیمان علیہ السلام کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علامہ میرٹھی کا مقالہ اشراق ڈیلس امریکہ جنوری ۲۰۲۴ء اور اس کا انگریزی ورژن فروری کے Ishraq میں شائع ہوا۔

''البتہ کہیں کہیں ضرورۃً اس میں کوئی فنی بات بھی آگئی ہے جیسے ترکیب یا لغوی و صرفی تحقیق۔ ظاہر ہے کہ وہ عربی داں حضرات ہی کے سمجھنے کی چیز ہے، غیر عربی داں حضرات مطالعہ میں اِس سے صرف نظر کر جائیں یا کسی عربی داں سے پوچھ کر سمجھ لیں''۔[۲۷]

اصل میں متقدمین کی تفاسیر میں یہ چیز بالکل عام ہے اور سلف میں کم و بیش ہر مفسر اس کا اہتمام کرتا رہا ہے۔ خاص طور پر ابو حیان اندلسی نے اور زمخشری نے اس کا بہت اہتمام کیا ہے۔ سلف کی متابعت میں علامہ میرٹھی نے بھی پوری تفسیر میں اِس کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے، کیونکہ ان کے سامنے علما و طالبان علوم عربیت رہے ہیں۔ اور ان کے خیال میں قرآنی آیات کی صرفی تحقیق اور نحوی ترکیب صحیح فہم کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ کتنے ہی مقامات ہیں جہاں صحیح ترکیب سمجھ میں نہ آنے سے لوگوں نے معنی کچھ کے کچھ بنا دیے ہیں۔ اس بارے میں علامہ کو زیادہ شکوہ صاحب تفہیم سے تھا، جو ان کے نزدیک عربیت کے اور صرف و نحو کے اغلاط سے بھری پڑی ہے۔ تاہم راقم کے خیال میں مولانا مودودی کا مخاطب طبقہ عصری طبقہ اور عوام تھے، جن کو ان دقیق مباحث سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ''تفہیم القرآن'' عام فہم ہے اور ''مفتاح القرآن'' اپنی ساری خوبیوں کے باوجود عصری طبقہ کے لیے مشکل بن گئی ہے۔ تاہم طالبان قرآن اور علما و محققین کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

تفسیر ''مفتاح القرآن'' سے ہم نے یہ کچھ مثالیں اور نمونے پیش کیے ہیں اور ہمیں احساس ہے کہ قارئین بوجھل ہو جائیں گے، اسی وجہ سے انھی مثالوں پر اکتفا کر رہے ہیں، ورنہ مصنف کے اجتہادات، تفسیری روایات کی تحقیقات اور نئے نئے معانی و مفاہیم کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جس سے یہ تفسیر مالا مال ہے۔ یہ چند مثالیں تو مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت سے نقل کر دی ہیں، ورنہ اس تفسیر میں ایسے صدہا مقامات ہیں جہاں مفسر گرامی نے متقدمین و متاخرین کی تفسیر کو قبول نہیں کیا اور اپنی الگ ہی تشریح پیش کی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے نقل صحیح، نقد حدیث، درایت، عربیت کے اسلوب، نظم کلام اور قلب سلیم سے کام لیا ہے۔ تفسیر ''مفتاح القرآن'' کے اس سرسری سے مطالعہ سے صاحب تفسیر کی یہ بات مبرہن ہو کر سامنے آتی ہے کہ ''لیکن متقدمین و متاخرین کی اِن تمام قابل قدر و مستحق احترام مساعی کے باوجود یہ خیال کر لینا مناسب نہ ہو گا کہ قرآن کریم کے متعلق ترجمہ و تفسیر کا اردو یا عربی یا کسی بھی زبان میں اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب ایک نیا ترجمہ یا ایک نئی تفسیر شائع

۲۷؎ علامہ میرٹھی، تفسیر مفتاح القرآن ۱/ ۱۳۔

کر دینا وقت اور محنت کا صحیح مصرف نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ بہت کم اور ناکافی ہے۔ اس بارے میں مسلسل محنت کرنے اور کوشش کرنے اور کرتے رہنے کی ضرورت ہے‘‘۔[48]

مقالہ نگار کے نزدیک اس تفسیر میں بعض کم زور پہلو بھی ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ تفسیر میں شروع کے حصوں میں بہت اطناب و تفصیل ہے، جو بعض اوقات قاری کو اکتاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

۲۔ اکثر آیات کی نحوی و صرفی ترکیب کی گئی ہے، جو ظاہر ہے کہ صرف عربی داں حضرات کے کام کی ہی ہو سکتی ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہوتا کہ متن تفسیر کے بجائے حاشیہ لگا کر ان میں یہ کام کیا جاتا تاکہ عام قاری اپنا تسلسل برقرار رکھتا اور جس کو دل چسپی ہوتی، وہ حاشیے کو دیکھ لیتا۔

۳۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مؤلف نے تفسیری روایات کی تحقیق و تنقیح میں بھی بہت اطناب و تفصیل سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں اہل بیت کون ہیں؟ اِس کی تفصیل میں انھوں نے ان تمام روایات پر کلام کیا ہے جو تفسیر و حدیث کی کتابوں میں مروی ہیں اور حضرات علی، فاطمہ و حسن و حسین کو بھی اہل بیت میں شامل کرتی ہیں۔[49]

راقم خاک سار کے نزدیک اس تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف قرآن کو محور بناتی ہے۔ صحیح حدیث کو اس کی تشریح سمجھتی ہے، باقی چیزوں اور دوسرے علوم کو اس میں زبردستی نہیں گھسیڑا گیا ہے۔ اس میں نہ بہت زیادہ فقہی مباحث ہیں، نہ ہی وہ کلامی مباحث سے بوجھل ہے اور نہ اس میں بے جا صوفیانہ و عارفانہ نکتہ طرازی کی گئی ہے۔ نہ اس میں فلسفہ و منطق یا جدید سائنس کی معلومات بھر دی گئی ہیں، بلکہ مصنف نے قرآن سے جو سمجھا ہے، اسی کو لکھ دیا ہے۔ البتہ جو لکھا ہے، وہ خوب چھان پھٹک کر اور تحقیق و تفتیش کے بعد لکھا ہے۔ نیز اس کی زبان بڑی دل آویز، رواں، سادہ اور دل کش ہے۔

اس سرسری سے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہے کہ تفسیر ’’مفتاح القرآن‘‘ ایک جلیل القدر علمی تفسیر ہے، بلاشبہ اس میں ظاہر کی گئی بہت سی رایوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اختلاف کرنا اہل علم کا حق ہے، مگر

۴۸۔ علامہ میرٹھی، تفسیر مفتاح القرآن ۱/۱۴۔

۴۹۔ ملاحظہ ہو: تفسیر مفتاح القرآن، چوتھی جلد، تفسیر آیۂ اہل البیت سورۂ احزاب اور راقم کا مقالہ ’’قرآن میں اہل البیت سے کیا مراد ہے؟‘‘، اشراق لاہور، جنوری/فروری ۲۰۲۴ء۔

یہ ضرور ہے کہ یہ تفسیر کتاب الٰہی کے بہت سے معانی سے پردہ اٹھاتی، بہت سے نئے مباحث اٹھاتی اور نئے نکات سجھاتی ہے۔ قرآن کے طالبوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اور بلاشبہ اس تفسیر میں مصنف نے وہی سمجھانے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے جو آیات قرآن کا مطلب و معنی ہے۔ اور جو بات بھی لکھی ہے، نہایت تحقیق اور شرح صدر کے ساتھ لکھی ہے۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ''جلالین'' کے طرز پر لکھی تھی، یعنی پہلے ایک آیت ذکر کرتے، پھر اس کا ترجمہ اور تفسیر بھی ساتھ ساتھ کر دیتے۔ عصر حاضر کے مذاق علمی کو سامنے رکھتے ہوئے خاک سار مقالہ نگار نے اس کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ اب اس میں یہ ترتیب اختیار کی گئی ہے کہ پہلے ایک رکوع متن قرآن کا دیا گیا، اس کے بعد اس کا ترجمہ پھر متعلقہ آیات کی تفسیر کی گئی ہے۔ فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کوشش کر رہا ہے کہ کتاب عزیز کی اس جلیل القدر تفسیر کو جلد از جلد منظر عام پر لائے تاکہ قرآنی مطالعات و تحقیقات کا ایک نیا باب روشن ہو اور طالبان قرآن ایک نئی روشنی میں اپنا سفر طے کریں۔

وارث مظہری*

اہل کتاب خواتین سے نکاح

جواز و عدم جواز کی بحث

اسلام میں مشرکین سے واضح امتیاز برتتے ہوئے اہل کتاب کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا گیا ہے اور ان کی خواتین سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ جمہور کا اس پر اتفاق ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ وتابعین کو اس سے اختلاف بھی رہا ہے۔ اسلامی تاریخ میں جمہور کے قول پر ہی عمل رہا ہے۔ البتہ موجودہ دور میں کئی اعتبارات سے اس مسئلے پر سوالات اٹھائے جانے لگے ہیں اور اس حوالے سے مختلف رجحانات ابھر کر سامنے آئے ہیں:

ایک رجحان جمہور صحابہ وتابعین کے موقف کے مطابق بالکلیہ جواز کے حق میں رہا ہے، جب کہ دوسرا رجحان اس کے مکمل طور پر حرام ہونے کا قائل ہے۔ دور جدید میں عالم اسلام کی بعض اہم شخصیات، مثلاً محمد یوسف موسیٰ، علامہ ابن بادیس وغیرہ مطلق تحریم کی قائل رہی ہیں۔ یوسف موسیٰ کی اس موضوع پر کتاب کا نام ہے: ''جريمة الزواج بغير المسلمات: فقهًا وسياسة''۔ تیسرا رجحان ان دونوں کے مابین ہے، یعنی یہ کہ کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ مع الکراہت اس کی اجازت ہے۔ کم و بیش یہی تینوں رجحانات اپنی تائید میں دلائل کے اختلاف کے ساتھ ماضی میں بھی رہے ہیں۔

کتابیہ کے ساتھ نکاح کے جواز کے دلائل

اہل کتاب خواتین کے ساتھ نکاح کے جواز کی دلیل سورۂ مائدہ (۵) کی پانچویں آیت ہے:

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی۔ ای میل: w.mazhari@gmail.com۔

اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ ۪ وَطَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ ۫ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ.

”آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں، خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا اُن قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔“

اس پر عمل کرتے ہوئے متعدد صحابۂ کرام نے بھی اہل کتاب خواتین سے شادیاں کیں۔ خود خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی نے نائلہ بنت الفرافصہ الکلبیہ سے شادی کی، جو بعد میں مسلمان ہو گئیں۔ اسی طرح حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما وغیرہ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ انھوں نے کتابی خواتین سے شادیاں کیں (احکام القران ۲/ ۴۰۸-۴۰۹)، چنانچہ ”تفسیر ابن کثیر“ میں ہے:

وقد تزوج جماعة من الصحابة من نساء النصارى ولم يروا بذلك بأسًا أخذا بهذه الآية الكريمة (أى آية المائدة:۵). (ابن کثیر ۲/ ۲۸)

”اسی سورہ مائدہ کی پانچویں آیت سے استدلال کرتے ہوئے صحابہ وتابعین کی ایک جماعت نے نصاریٰ کی عورتوں سے شادی کی اور اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔“

البتہ بعض فقہا سے مختلف شرطیں اور قیود مروی ہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کے نزدیک بنی تغلب (مسیحی عرب قبیلہ) کی خواتین سے نکاح جائز نہیں ہے۔ امام شافعی اس کے جواز کو صرف اسرائیلی خواتین کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے جس میں بنی اسرائیل کو اہل کتاب قرار دیا گیا ہے: ’وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّةَ‘، ”اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت اور نبوت سے نوازا (الجاثیہ ۴۵: ۱۶)۔

صحابہ میں سے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا موقف ہے کہ صرف ذمی و معاہد خواتین سے نکاح جائز ہے (ابو بکر جصاص، احکام القرآن ۴۱۱)۔ تاہم جمہور اس تفریق کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ذمی وغیر ذمی اور معاہد و محارب، دونوں طرح کی اہل کتاب خواتین سے نکاح جائز ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کے جواز کے ساتھ اس میں کراہت پائی جاتی ہے۔

عدم جواز کے قائلین اور ان کے دلائل

عدم جواز کے قائلین میں صحابۂ کرام میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا نام آتا ہے۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ جب ان سے یہودی و نصرانی خواتین کے ساتھ نکاح کی بابت سوال کیا جاتا تھا تو وہ جواب دیتے تھے کہ:

إن الله حرم المشركات على المسلمين ولا أعلم من الشرك شيئًا أعظم من أن تقول ربها عيسىٰ بن مريم وهو عبد من عبيد الله. (احکام القرآن ۲/ ۴۰۹)

”اللہ تعالیٰ نے مومنین پر مشرک خواتین کے ساتھ نکاح کو حرام قرار دیا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ اس سے بڑھ کر اور شرک کیا ہو گا کہ وہ، (یعنی مسیحی خواتین) اس کی قائل ہوں کہ ان کا رب حضرت مسیح ہے، حالاں کہ وہ خدا کے بندے تھے۔“

حضرت عبد اللہ بن عمر کا استدلال سورۂ بقرہ کی اس آیت سے ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی عورتوں سے نکاح سے منع کیا ہے:

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ‌ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ. (۲: ۲۲۱)

”اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک مسلمان نہ ہو جائیں اور بے شک مسلمان لونڈی مشرکہ عورت سے اچھی ہے، اگرچہ وہ تمھیں پسند ہو۔“

موجودہ دور میں اس رجحان کے نمایندگان کی دلیل یہ ہے کہ اب اہل کتاب خاص طور پر مسیحی اپنے صحیح دین پر عامل نہیں رہے۔ سیکولر مادیت کا رجحان اس پر اس قدر غالب آچکا ہے کہ مذہب کے بنیادی حقائق اور اساسی تصورات پر ان کا یقین باقی نہیں رہا۔ اس طرح اصل مسیحیت گم ہو چکی ہے۔ بنا بریں، ان کے ذبیحے اور ان کی خواتین کے ساتھ نکاح کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بعض اصحاب علم کی راے یہ رہی ہے کہ اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو غیر محرف مذہبی کتابوں کے پیروکار ہیں، لیکن یہ نہایت کم زور بات ہے۔ علامہ رشید رضا ”تفسیر المنار“ میں لکھتے ہیں:

قد أحل أكل طعام أهل الكتاب

”اہل کتاب کے ذبیحے اور ان کی خواتین کے

ونكاح نسائهم على الحال التي كانوا عليها في زمن التنزيل وكان هذا من آخر ما نزل من القرآن. وقد وصفهم بأنهم حرفوا كتبهم ونسوا حظًا مما ذكروا به في هذه السورة نفسها كما وصفهم فيما نزل قبلها ولم يتغير يوم استنبط الفقهاء تلك المسألة شيء من ذلك.(۱۷۹/۶)

ساتھ نکاح کو اس حال کے باوجود جائز قرار دیا گیا جس حال پر نزول قرآن کے زمانے میں وہ تھے۔ قرآن کی یہ آیت جس میں اہل کتاب کے ذبیحے اور ان کی خواتین کے ساتھ نکاح کو حلال قرار دیا گیا ہے، نزول قرآن کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے۔ قرآن کے مطابق اہل کتاب اپنی کتابوں میں تحریفات کے مرتکب ہوئے اور احکام خداوندی کے بڑے حصے کو انھوں نے بھلا دیا تھا، اسی کا ذکر اسی سورت میں موجود ہے۔ اہل کتاب کے اوصاف کا ایسا ہی بیان سورۂ مائدہ سے قبل نازل ہونے والی آیات قرآنی میں موجود ہے۔ اور اس بیان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، (یعنی اس کا کوئی حصہ منسوخ نہیں ہوا تھا) جب فقہا نے اہل کتاب کے ذبیحے اور ان کی خواتین کے ساتھ نکاح کے حلال ہونے کا مسئلہ مستنبط کیا۔“

ممکنہ درست موقف کیا ہے؟

ابن قدامہ ”المغنی“ میں لکھتے ہیں:

ليس بين أهل العلم اختلاف في حل حرائر نساء أهل الكتاب ومن روى عنه ذلك عمر و عثمان و طلحه و حذيفه و سلمان و جابر وغيرهم. (۵۴۵/۹)

”اہل علم کے درمیان اہل کتاب آزاد خواتین کے ساتھ نکاح کے حلال ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت عمر، عثمان، طلحہ، حذیفہ، سلمان اور جابر رضی اللہ عنہم سے اس کے حلال ہونے کا موقف مروی ہے۔“

رئیس المفسرین حضرت عبد اللہ ابن عباس کا موقف ہے کہ یہ آیت جس میں مشرک خواتین سے نکاح کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ سورۂ مائدہ کی مذکورہ آیت سے منسوخ ہے۔ جہاں تک حضرت عبد اللہ ابن عمر کے موقف

کا سوال ہے تو بعض علما نے اسے تحریم کے بجاے کراہت پر محمول کیا ہے۔ ابن تیمیہ اور بعض دوسرے علما کی یہی راے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس شدت کے ساتھ یہ قول ان سے مروی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی حرمت کے ہی قائل تھے اور اس آیت (البقرہ ۲۲۱) کو جس میں مشرکین کے ساتھ نکاح سے منع کیا گیا ہے، دوسری آیت (المائدہ ۵) کا ناسخ تصور کرتے تھے، جس میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ابن تیمیہ کے نزدیک حضرت ابن عمر کا قول کراہت پر محمول ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وقد روى عن ابن عمر أنه كره نكاح النصرانية وقال: لا أعلم شركاً أعظم ممن تقول: إن ربها عيسٰى ابن مريم. وهو اليوم مذهب طائفة من أهل البدع وقد احتجوا بالآية في سورة البقرة. (مجموع الفتاوی ۹۱/۱۴)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم کا ایک طبقہ مطلقًا اس کے عدم جواز کا بھی قائل رہا ہے، لیکن مستند اہل علم اسے بدعت سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ فقۂ جعفری کا نقطۂ نظر وہی ہے جو حضرت عبد اللہ ابن عمر کا ہے۔

میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ اس حوالے سے علماے امت کے درمیان دو موقف رہے ہیں۔ دو مواقف کی تعبیر اس وقت درست ہو گی، جب کہ دوسرے موقف کے حاملین میں قابل ذکر علما کی ایک تعداد شامل ہو، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں تک حضرت عبد اللہ ابن عمر کے موقف کا معاملہ ہے تو اسے ان کے تفرد پر محمول کرنا چاہیے، جس کی مثالیں صحابۂ کرام کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں، جیسے ابو طلحہ اولہ کھانے کو ناقض صوم تصور نہیں کرتے تھے اور حضرت حذیفہ طلوع آفتاب تک سحری کھانے کی گنجایش کے قائل تھے۔

جواز و عدم جواز سے ہٹ کر ایک رجحان ابتدا سے جواز کے ساتھ کراہت کا رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے حضرت حذیفہ سے فرمایا کہ وہ اپنی کتابی بیوی کو طلاق دے دیں۔ حضرت علی سے بھی کراہت منقول ہے۔ اسی طرح تابعین میں عطاء بن رباح اور تبع تابعین و فقہاے مجتہدین میں حضرت امام مالک سے شدت کراہت کا قول مروی ہے، جب کہ ابن تیمیہ نے اکثر علما سے کراہت نقل کی ہے۔

معاصر کتابی خواتین کے ساتھ نکاح کا حکم

اس موضوع پر گفتگو کی دوسری شق اور اس کا مرکزی پہلو یہ ہے کہ موجودہ دور میں کتابی خواتین کے ساتھ نکاح کے جواز و عدم جواز کے حوالے سے ممکنہ درست موقف کیا ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے پیدا ہونے کی مختلف وجوہات ہیں، جن میں سے اہم یہ ہیں:

یورپ میں اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے بعد مسیحیت کے مذہبی تصورات میں اساسی نوعیت کا تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً خدا کے حوالے سے ڈے ازم (Deism) کا تصور، جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا کا فعال تعلق اس کائنات کے ساتھ باقی نہیں رہا۔ اس نے دنیا کی تخلیق تو ضرور کی ہے، لیکن اب نظام کائنات سے وہ دست کش ہو چکا ہے۔ اسی طرح غیر مشخص یا امپر سنل گاڈ (impersonal God) کا تصور، جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا کی ذات اس کائنات سے الگ نہیں ہے، بلکہ اس کا حصہ ہے۔ وہ کوئی مشخص ذات نہیں کہ ہر شخص اس سے اپنا تعلق قائم کرے اور اس سے دعائیں مانگے۔ یہ تو تب ہے، جب کہ کم از کم خدا کے وجود کو تسلیم کیا جائے، ورنہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے اکثر مفکرین ملحد و مادیت پرست رہے ہیں، جیسے نطشے، مارکس، فرائڈ، فیور باخ وغیرہ۔ اب اس وقت سیکولرازم نے الحاد کی ہی نہیں، بلکہ بقول کنیڈین فلاسفر چارلس ٹیلر الحاد کے دھماکا کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس پہلو کا سب سے بہترین مطالعہ ٹیلر نے اپنی کتاب ''A Secular Age'' میں کیا ہے۔

دوسری اہم وجہ یورپ کا سماج ہے۔ وحی کے بجائے مجرد اور تکنیکی عقل اور روحانیت سے مکمل پہلو تہی کے ساتھ محض سیکولر مادیت کی بنیاد پر یورپ میں جس اخلاقیات کو پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے، اس میں حیا و عفت کے تصورات بہت حد تک اباحیت میں گم ہو چکے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں کتابیہ سے شادی کا جواز اس سماجی سیاق سے تعلق رکھتا ہے جب اسلام کو ایک تہذیبی قوت حاصل تھی۔ وہ اپنا سیاسی و ثقافتی غلبہ رکھتا تھا، اس لیے کتابی خواتین کے حوالے سے یہ امید غالب تھی کہ وہ اسلامی ماحول میں اسلام کی خوبیوں سے متاثر ہو کر یا تو اسلام قبول کر لیں گی یا کم از کم شوہر اور بچوں پر زیادہ اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گی، لیکن اب صورت حال بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔ سیاسی و تہذیبی مغلوبیت کے شکار مسلمانوں کی اکثریت دوسروں کو اپنے اسلامی رنگ میں رنگنے کے بجائے اس کے غیر اسلامی رنگ میں رنگے جانے کی صلاحیت زیادہ رکھتی ہے۔ مغرب کی آزاد سوسائٹی میں بچوں کی اسلامی تربیت تو ویسے ہی ایک بڑا چیلنج ہے۔ ایسی صورت میں، جب کہ ماں غیر مسلم ہو، اس کا یہ امکان بہت کم رہ جاتا ہے کہ اس تربیت کی کمی باپ سے پوری ہو جائے گی۔

ایسی صورت میں درست موقف یہ نظر آتا ہے کہ اہل کتاب خواتین سے نکاح جائز تو ہے، لیکن وہ جن شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، ان کا وجود معدوم نہیں تو بہت حد تک مشکوک ضرور ہے۔ اہل کتاب اور محصنات کے تصور میں شرط کے طور پر بظاہر یہ بات شامل ہے کہ کتابی خواتین سماوی دین کے بنیادی تصورات پر

قائم ہوں اور یہ ہے کہ وہ عفیفہ اور پاک باز ہوں، جو آج مغربی معاشرے میں بہت کم ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ نص کے جواز کو محدود سے محدود تر رکھنے کی کوشش کی جائے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا موقف اس حوالے سے بہت حد تک اعتدال پر مبنی ہے۔ وہ متعلقہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اگر ماحول اسلامی تہذیب و معاشرت کا ہو اور آدمی کسی نیک چال چلن کی کتابیہ سے نکاح کر لے تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن کافرانہ ماحول میں جہاں کفر اور اہل کفر کا غلبہ ہو اس قسم کا نکاح چاہے اس آیت کے الفاظ کے خلاف نہ ہو لیکن اس کے فحویٰ، اس کی روح اور اس کے موقع و محل کے خلاف ضرور ہے۔... اسلام کے بہت سے قوانین دار الاسلام کی شرط کے ساتھ مشروط ہیں۔ اسی طرح بعض رخصتیں اور اجازتیں بھی خاص ماحول اور خاص حالات کے ساتھ مشروط ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۶۶)

محمد ذکوان ندوی

کائنات کا پہلا گناہ

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا پہلا گناہ شراب، زنا اور خنزیر جیسی چیزیں نہیں، بلکہ کائنات کا پہلا گناہ کبر وانانیت تھا، یعنی اِس زعم کا احساس کہ میں دوسرے شخص کے مقابلے میں زیادہ بہتر حیثیت رکھتا ہوں: ’اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ‘ (الاعراف ۷: ۱۲)۔

انا یا انانیت کا مطلب ہے: عمداً حق کو نظر انداز کرنا اور اپنے مقابلے میں دوسرے لوگوں کو کم تر اور حقیر سمجھنا (بطر الحق، وغمط الناس)۔

انسان چونکہ فکری اور حیوانی وجود کا ایک دوطرفہ مجموعہ ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی میں انانیت کا ظہور اصلاً دو صورتوں میں ہوتا ہے: ایک، فکری سطح پر اور دوسرے، عملی سطح پر۔

اِس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ اِن دونوں سطح پر بہت زیادہ خبر دار (alert) رہے۔ وہ فکر و عمل، دونوں سطح پر انانیت کے مہلک تلوثات سے اپنے آپ کو بچائے۔ وہ ہمیشہ حق وصداقت کا طالب رہے اور جب بھی ایسا ہو کہ یہ حق وصداقت کسی بھی صورت میں اُس پر ظاہر ہو تو وہ ادنیٰ ذہنی تحفظ اور کسی سابقہ تعصب کے بغیر خدا کے ایک براہ راست فیضان کی حیثیت سے اُسے قبول کرے اور اپنے دل و دماغ کے تمام دروازے اُس کے لیے کھول کر اُس کا حامی و ناصر بن جائے۔ حق وصداقت کی نصرت و حمایت خود خداوند ذوالجلال کی نصرت (محمد ۴۷: ۷) ہے۔ امتحان کی اِس دنیا میں خدا ہمیشہ حق وصداقت کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں حق وصداقت کا ظہور سادہ معنوں میں، صرف حق وصداقت کا ظہور نہیں، بلکہ وہ خود خداوند ذوالجلال کے ظہورِ اجلال کے

ہم معنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کبر وانانیت وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جس کے سہارے کوئی شخص کھڑا ہوتا ہے۔ خالق کی بنائی ہوئی اِس دنیا میں کسی مخلوق کے لیے سرے سے اِس بات کا کوئی جواز نہیں کہ وہ خدا کی اِس دنیا میں کبر و انانیت اور خود پرستی کا جھوٹا گنبد تعمیر کرے۔ خدا کی اِس دنیا میں شرک اور کبر کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ساری عظمت و بڑائی صرف اور صرف ایک خالق ومالک اور ایک قادر مطلق خدا کے لیے ہے، نہ کہ کسی عاجز و فانی مخلوق کے لیے۔

کبر وخود پسندی سے متعلق کچھ پیغمبرانہ ارشادات

کبر وخود پسندی کی اِسی شناعت کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا شخص خدا کے پڑوس میں کبھی جگہ نہیں پاسکتا، کیونکہ ساری بڑائی صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے:

☆ عن عبد الله قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم «لا يدخل الجنة أحدٌ في قلبه مثقال حبة خردل من كبرياء». (مسلم، رقم ۲۷۶)

”عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر و برتری کا مزاج پایا جائے، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“

☆ عنْ أنسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاقَةٌ تُسَمَّى الْعَضْبَاء لَا تُسْبَقُ. قَالَ حُمَيْدٌ: أَوْ لَا تَكَادُ تُسْبَقُ. فَجَاءَ أَعْرَابِيٌّ عَلَى قَعُودٍ فَسَبَقَهَا، فَشَقَّ ذَلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ حَتّى عَرَفَهُ. فَقَالَ: «حَقٌّ عَلَى اللهِ أن لَا يَرْتَفِعَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا وَضَعَهُ». (بخاری، رقم ۶۵۰۱)

”انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں العَضْبَاء نام کی ایک اونٹنی تھی۔ کوئی جانور دوڑ میں اُس سے آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔ پھر ایک اعرابی اپنے اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور وہ مقابلے میں آپ کی اونٹنی سے آگے بڑھ گیا۔ مسلمانوں پر یہ معاملہ بہت شاق گزرا۔ وہ کہنے لگے کہ افسوس! عضباء پیچھے رہ گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ لازم فرمالیا ہے کہ جب وہ دنیا میں کسی چیز کو بڑھاتا ہے تو اُسے گھٹا بھی دیتا ہے۔“

☆ عن عياض بن حمار أخي بني مجاشع قال: قَامَ فِينَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ خَطِيبًا، فَقَالَ: ...إنّ اللّٰهَ أوحى إليّ أن تَوَاضَعُوا، حَتّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِي أَحَدٌ عَلَى أَحَد. (مسلم، رقم ۷۲۱۰)

''بنی مجاشع کے بھائی عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ...اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تم سب تواضع اختیار کرو، حتیٰ کہ کوئی شخص دوسرے شخص پر فخر نہ کرے اور کوئی شخص دوسرے شخص پر زیادتی نہ کرے۔''

مصلحت امتحان کا تقاضا

خالق نے اِس دنیا کو امتحان کے مقصد کے تحت بنایا ہے۔ اِس مصلحت کا تقاضا ہے کہ موت تک یہاں بار بار آدمی پر کبر و حسد اور خود پسندی و انانیت جیسے مہلک جذبات کا حملہ ہو، وہ بار بار اِس طرح کے مسائل سے دوچار ہو، وہ مسلسل اِس طرح کے منفی احساسات کی زد میں آتا رہے۔ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ امتحان کی اِس دنیا میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدمی اِن احساسات سے خالی ہو سکے۔

اِس صورت حال کا علاج صرف یہ ہے کہ آدمی جب اِن منفی احساسات سے دوچار ہو تو وہ مستقل طور پر اُس کا شکار رہنے اور اُس سے حظ اندوز ہونے کے بجائے اُسے ایک مسِ شیطانی (الاعراف ۷: ۲۰۱) سمجھ کر رجوع اور انابت کا طریقہ اپنائے، وہ توبہ و استغفار اور شدید احتساب کے ذریعے سے فی الفور خدا کی طرف لوٹے، وہ اپنے عجز و بے ثباتی اور خدا کی قدرت و بے نیازی کو یاد کر کے اپنے آپ کو عبدیت کے مقام پر لا کر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرے۔ اِس طرح مسلسل توبہ و احتساب کے ذریعے سے اِس قسم کے مہلک احساسات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

روز مرہ کی زندگی میں آدمی یہی کر رہا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ایک شخص کپڑا استعمال کرتا ہے تو وہ میلا بھی ہوتا ہے، مگر اُس وقت کوئی شخص ایسا نہیں کرتا کہ وہ اُسے پھینک دے۔ اِس کے برعکس، وہ اُس کو صاف کر کے دوبارہ اپنے استعمال میں لے آتا ہے۔ داخلی اور روحانی معاملات میں بھی آدمی کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہاں بھی 'وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ' (المدثر ۷۴: ۴) پر عمل کرتے ہوئے بار بار اُسے اپنے دامن دل کو پاک کرنے اور اپنے قول و عمل اور اپنے فکر و نظر کا جائزہ و احتساب کرتے رہنے کی مسلسل جد و جہد جاری رکھنا چاہیے۔ اِس

صابرانہ اور مخلصانہ جہد و عمل کی حیثیت اُس 'عمل صالح' اور 'عبادت' کی ہوگی، جو اِس زندگی میں ایک انسان سے ہمیشہ مطلوب ہے۔

انانیت کا طوفان

مختلف قسم کے انسانوں کا وسیع اور طویل مطالعہ بتاتا ہے کہ کوئی بھی شخص کبر و حسد اور انانیت کے اِن نامطلوب احساسات سے خالی نہیں۔ چھوٹے، بڑے، امیر، غریب، بادشاہ، فقیر، مفلس، مخلص، فارغ البال، مفلوک الحال، داعی اور رہنما، مذہبی و غیر مذہبی ائمہ و قائدین، سب کسی نہ کسی اعتبار سے، اِس مخفی کبر کا شکار رہتے ہیں، سواے اُس کے جس پر اللہ اپنا خصوصی فضل و کرم فرمادے۔

اِس معاملے میں اکثر صرف مخفی اور غیر مخفی کبر کا فرق ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں آزادی و فراغت، وسائل کی بہتات اور سستی شہرت کے آن لائن و آف لائن مواقع نے ہر عورت اور مرد کی انانیت اور ریاونمود کے احساسات میں بے پناہ حد تک اضافہ کر دیا ہے۔

مواقع کی بہتات اور نعمتوں کی برسات شکر کی متقاضی تھی، مگر اِس عہد دجال کی پیشانی پر شکر کے بجاے اب تقریباً ہر طرف 'کفر' ہی 'کفر' نظر آتا ہے۔ آج کا فقیر بھی کسی امیر سے کم انا پرست دکھائی نہیں دیتا، حتیٰ کہ آج کے بچے بھی اپنے اندر انانیت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔

ایسی حالت میں خدا خود اپنی خاص رحمت سے جس شخص کو طوفان تزکیہ کے اِس گرداب میں ڈال کر اُس کے اندر چھپے ہوئے انانیت کے اژدہے کو کچل دے، وہی اِس زہر اب سے بچ سکتا ہے، ورنہ کبر و نخوت کا یہ اژدہا ہر ایک کو ڈس کر رہتا ہے، اِس سے بچنا سخت مشکل ہے۔

اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خود اپنا محاسب بن جائے، وہ بے رحمانہ احتساب کے ذریعے سے اپنے اندر پائے جانے والے متکبرانہ عناصر کا جائزہ لے، وہ ہر پہلو سے کھرچ کھرچ کر اپنے اندر سے کبر و نخوت کے مزاج کا خاتمہ کرے، وہ اپنی تنہائیوں میں اللہ سے دعائیں کرے اور تلاوت و تدبر کے ذریعے سے مسلسل اصلاح ذات کا یہ عمل جاری رکھے۔ اِسی کے ساتھ وہ یہ کرے کہ اپنے قریبی رفقا، اساتذہ اور اپنے اہل خانہ و متعلقین کو اپنا نگراں اور محاسب بنائے۔ وہ اُن سے کہے کہ بار بار وہ اِس طرح کی صورت حال پر بلا تکلف اُس کا محاسبہ کرتے رہیں۔ یہی 'براہیمی نظر' اور یہی 'جہاد نفس' آدمی کو اِس مہلک

بیماری سے محفوظ رکھ سکتا ہے:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!

[سری نگر-ماگام، کشمیر ۵/جون ۲۰۲۴ء]

محمد بلال

حیات امین احسن

(۲۲)

باب ۱۶

شاگرد

امین احسن پیروکاروں کی کثرت کے بجائے چند شاگرد بنا لینے کو ترجیح دیتے تھے، اور پھر ان کی تربیت کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ ذیل میں امین احسن کے اہم شاگردوں کا تعارف درج کیا جاتا ہے۔

خالد مسعود

خالد مسعود صاحب کی پیدایش پنجاب کے ضلع جہلم میں ۱۶/ دسمبر ۱۹۳۵ء کو ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیمسٹری میں ماسٹر کیا۔ ۱۹۶۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے۔ اور کنگز کالج کیمبرج سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا۔ ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اسلامیات میں ماسٹر کیا۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت پنجاب میں ملازمت کی اور ۲۷ برس کام کیا۔ ۱۹۸۵ء میں انھیں قائد اعظم لائبریری، باغ جناح لاہور میں ریسرچ اسکالر کے عہدے کی پیش کش ہوئی۔ اس عہدے سے ۱۹۹۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ دور طالب علمی (۱۹۵۶ء-۱۹۵۸ء) میں اسلامی جمعیت طلبہ لاہور کے ناظم رہے، مگر بعد میں جماعت اسلامی میں شامل ہونے کے بجائے امین احسن سے قرآن پڑھنے کو ترجیح دی۔ امین احسن کی وفات تک ان کے سب سے اہم ترین ساتھی

اور سینئر شاگرد رہے۔ ۲۲/ جون ۲۰۰۲ء کو راقم خالد مسعود صاحب کو ان کے گھر ملا۔ مقصد یہ تھا کہ خالد صاحب کا تعارف ان کی زبانی حاصل کیا جائے۔ ذیل میں یہ تعارف درج کیا جاتا ہے۔

خالد مسعود گورنمنٹ کالج سرگودھا میں پڑھتے تھے۔ وہاں امین احسن نے ایک خصوصی لیکچر دیا۔ اس طرح خالد صاحب مولانا سے متعارف ہوئے۔

پھر خالد صاحب بی ایس سی کرنے کی غرض سے گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہوئے۔ اس کالج کے قریب ایک مولوی برکت علی ہال تھا۔ مولانا وہاں درس دیتے تھے۔ خالد صاحب کا اعلیٰ ذوق انھیں وہاں کھینچ لایا۔ دین کو نسبتاً بہتر سطح پر سمجھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دوران میں خالد صاحب نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کر لی۔ جلد ہی انھیں گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں لیکچرر کی ملازمت مل گئی، مگر خالد صاحب کی منزل اس سے بہت آگے تھی۔ ایک طرف یہ ملازمت تھی اور دوسری طرف امین احسن کی صحبت۔ ایک آزمایش پڑی۔ خالد صاحب سرخرو ہوئے۔ امین احسن کی صحبت کو ترجیح دی۔ خالد صاحب نے سماجی اور مالی لحاظ سے بہتر ملازمت چھوڑی اور لاہور میں فروتر ملازمت کر لی، مگر درحقیقت ایک برتر راہ اختیار کر لی۔

پھر خالد صاحب کے شدت شوق میں اضافہ ہوا، انھوں نے محبوب سبحانی صاحب کے ساتھ مولانا کے پاس باقاعدہ جانا شروع کیا، مگر مولانا انھیں ''باقاعدہ'' اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا مولانا کے پاس باقاعدہ حاضر ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا اصل میں انھیں آزما رہے تھے۔ ایک دن بولے:

> ''معلوم ہوتا ہے آپ لوگ تو قرآن پڑھنے کا پکا ارادہ کر چکے ہیں، ورنہ لوگوں میں قرآن پڑھنے کا ابال پیدا ہوتا رہتا ہے۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا نے جماعت اسلامی کو ابھی چھوڑا ہی تھا۔ مولانا اپنا رسالہ ''میثاق'' جاری کر چکے تھے۔ مولانا کو دوسروں کے مضامین پسند نہیں آتے تھے، اس لیے رسالے کے تمام مضامین خود ہی لکھتے تھے، مگر اس قدر سخت معیار پسندی کا فطری نتیجہ جلد ہی نکل آیا۔ ایک دن بولے:

> ''بھئی، میں تو تھک جاتا ہوں۔ رسالے کے تمام مضامین لکھنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔''

خالد صاحب نے ایک عملی حل پیش کیا:

> ''آپ دوسرے لوگوں سے بھی لکھوائیں۔''

خالد صاحب رسالے کی پروف ریڈنگ تو کرتے ہی تھے، اب انھوں نے مولانا کی اجازت سے ایک ترجمہ بھی کیا۔ اس طرح ''میثاق'' میں پہلی دفعہ کسی اور شخصیت کا کام شائع ہوا۔ اس کے علاوہ خالد صاحب کے

کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوئے۔

خالد صاحب کا کام دیکھ کر امین احسن کو احساس ہوا:

"اگر جدید پڑھے لکھے لوگوں پر کام کیا جائے تو اس کے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔"

چنانچہ انھوں نے خالد صاحب سے کہا:

"اگر آپ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں تو میری خواہش ہے کہ آپ کو باقاعدہ پڑھاؤں۔"

خالد صاحب کے دل کی مراد پوری ہوئی۔ انھوں نے کچھ احباب کو جمع کیا۔ جلد ہی طالب علموں کا ایک گروپ بن گیا۔ ۱۹۶۲ء میں یہ گروپ "حلقۂ تدبر قرآن" کے نام سے منظم ہو گیا۔ عصر سے عشا تک روزانہ پڑھائی شروع ہوئی۔ مدرستہ الاصلاح کا نصاب اختیار کیا گیا۔ بھارت سے اس مدرسہ کی ایک کتاب "اسباق النحو" نمونے کے طور پر آئی ہوئی تھی۔ تدریس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ کتاب ایک تھی۔ فوٹو کاپی کی سہولت ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ جیسے تیسے سب ایک کتاب سے استفادہ کرتے تھے۔ بعض احباب نے ہاتھ سے لکھ کر اس کتاب کی نقل تیار کی۔ اس کے بعد کہانیوں کی ایک کتاب پڑھائی گئی۔ پھر "کلیلہ ودمنہ" کی پڑھائی ہوئی۔ تدریس میں حکیمانہ تدریج اختیار کی گئی۔ کہانیوں کے بعد سنجیدہ ادب کی طرف رخ کیا گیا۔ اس کے بعد "مقدمہ ابن خلدون"، "حماسہ" اور عربی ادب پڑھایا گیا۔ اس تنوع کا مقصد یہ تھا کہ ہر طرح کی چیزیں پڑھ لی جائیں۔ یہ تدریس مغرب تک ہوتی۔ مغرب کے بعد قرآن اور حدیث (صحیح مسلم) کا درس دیا جاتا۔ قرآن اور مسلم کو مکمل طور پر پڑھایا گیا۔

اس کے بعد خیال ہوا کہ فقہ نہیں پڑھی گئی، اس کا بھی کچھ آئیڈیا ہونا چاہیے۔ لہٰذا پھر "بدایۃ المجتہد" پڑھی گئی۔ یہ تدریس جاری تھی کہ امین احسن کے بڑے بیٹے ابو صالح اصلاحی ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ امین احسن کے اوپر اس حادثے کا غیر معمولی اثر ہوا۔ گھر کی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی ان کے کندھوں پر آ گیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک ذہنی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ حلقہ معطل ہو گیا۔

"میثاق" ڈاکٹر اسرار احمد کے حوالے کر دیا گیا۔[16]

مولانا کے لیے یہ بہت مشکل زمانہ تھا۔ بھولنے کا عارضہ اس قدر شدید صورت اختیار کر چکا تھا کہ یہ بھی بھول جاتے تھے کہ یہ جو صاحب ملنے آئے ہیں، یہ کون ہیں۔ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ان کی ساری یادداشت ہی نہ ختم

۱۶؎ مولانا کی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ذہنی مناسبت نہیں تھی۔ وہ اس میں اپنی طرز کے مضامین شائع کرتے تھے۔ مولانا اس پر برہم ہوتے کہ یہ انھوں نے کیا شائع کر دیا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اختلافات سامنے آنے لگے۔

ہو جائے، اور مولانا نے اتنی محنت کر کے جو علم حاصل کیا ہے، وہ اس سے محروم ہی نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر اسرار کہا کرتے تھے کہ اب مولانا کچھ نہیں کر سکتے، اب وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ اور بعض لوگ خط لکھا کرتے تھے کہ اللہ کرے کہ ہماری عمر آپ کو لگ جائے تاکہ آپ اپنا کام کر سکیں۔ "تدبر قرآن" سورۂ توبہ تک مکمل ہو چکی تھی۔ مولانا کہتے تھے کہ اگر میں مزید کام نہ بھی کر پایا تو اتنا کام ہو چکا ہے جو نظم قرآن کو سامنے لے آئے۔

۱۹۶۸ء میں اس حادثے کا اثر کم ہوا تو تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ مولانا نے لاہور میں ایک کوٹھی کرایے پر لی ہوئی تھی، دوسرے اخراجات بھی بہت زیادہ تھے۔ شہری زندگی کے رکھ رکھاؤ پر بھی بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ مولانا نے کہا کہ لاہور میں گزارہ نہیں ہوتا، لہٰذا مولانا اپنے گاؤں رحمٰن آباد میں چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے اپنا علمی کام جاری رکھا۔ گاؤں میں وہ آٹھ برس رہے۔

خالد صاحب نے عربی زبان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ایک مشکل اور دل چسپ طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کچھ لوگوں کو اپنے گھر جمع کیا اور انھیں عربی زبان پڑھانی شروع کر دی۔ پڑھاتے ہوئے خالد صاحب کو ایک دل چسپ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے شاگردوں میں ایک پروفیسر صاحب بھی شامل تھے۔ جب تک وہ خود اچھی طرح واضح نہ ہو جاتے، ان کے سوالات جاری رہتے۔ مجبوراً خالد صاحب کو بہت زیادہ تیاری کرنی پڑتی تھی۔ صورت حال کی اسی سختی نے ان کی عربی زبان کی تفہیم مزید بہتر کر دی، حتیٰ کہ "اسباق النحو" اپنے طریقے پر مرتب کر دی۔

خالد مسعود صاحب نے راقم کو بتایا کہ ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء میں غامدی صاحب سے میرا تعارف ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے گھر میں کرایا۔ غامدی صاحب وہاں آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ جاوید صاحب گڑھی شاہو میں درس دیتے ہیں۔ نوجوان آدمی ہیں۔ انھوں نے ایک بہت اچھا حلقہ بنا لیا ہے۔

خالد مسعود صاحب نے امین احسن کے ترجمۂ قرآن کو ضروری اور مختصر تشریحات کے ساتھ الگ سے مرتب کیا۔ سیرت النبی کی قرآن مجید کو بنیاد بنا کر منفرد کتاب "حیات رسولِ امی" کے مصنف ہیں۔ عربی گرائمر پر کتاب "اسباق النحو" مرتب کی۔ امین احسن کے ساتھ مل کر یہ کتابیں مرتب کیں: "مفردات القرآن"، "اسالیب القرآن"، "جمہرۃ البلاغہ"، "الامعان فی اقسام القرآن"، "الرأی الصحیح فی من ہو الذبیح"، اور "نظام القرآن"۔

سہ ماہی "تدبر" لاہور کے مدیر تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے سائنسی موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں۔

یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ہیپاٹائٹس سی کے باعث جناع ہسپتال لاہور میں وفات پائی۔ جناب جاوید احمد غامدی نے سمن آباد، ڈونگی گراؤنڈ میں ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ جہلم کے گاؤں للہ میں آبا و اجداد کے ساتھ تدفین ہوئی۔

جاوید احمد غامدی

جاوید احمد صاحب غامدی کا آبائی وطن اگرچہ ضلع سیالکوٹ کا ایک قصبہ داؤد ہے، لیکن پیدایش پنجاب کے ضلع ساہیوال، پاک پتن کے قریب گاؤں شاہ جیون شاہ میں ہوئی۔ ان کے والد محترم محمد طفیل جنیدی کا تعلق داؤد کے ساتھ تھا جو لاہور سے ۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کے والد قادری جنیدی صوفی سلسلے کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ غامدی صاحب چھٹی یا ساتویں جماعت کے طالب علم تھے کہ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ درس نظامی کی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ میٹرک تک تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول، پاک پتن سے اور نانگپال کے مولوی نور احمد صاحب سے عربی، فارسی اور قرآن کی تعلیم حاصل کی۔

غامدی صاحب کے دادا نور الٰہی صاحب کو گاؤں میں ایک مصلح کی حیثیت حاصل تھی۔ اُن کی نیکی، خدا ترسی اور دانائی کی وجہ سے لوگ اپنے جھگڑے چکانے کے لیے اُن کی طرف رجوع کرتے اور اُن کا ہر فیصلہ مان لیتے تھے۔ غامدی صاحب بزرگوں سے دادا کی باتیں سنتے تو بے حد متاثر ہوتے۔ ایک مرتبہ عرب جاہلی کی تاریخ کا قصہ سنا کہ بنو غامد کے ابوالآبا نے صدیوں پہلے کسی معاملے پر پردہ ڈالا اور اِس طرح اصلاح احوال کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اِسی بنا پر اُنھیں ''غامد'' کا لقب دیا گیا اور 'غمد الأمر' کے الفاظ اِس کے بعد عربی زبان میں 'أصلح الأمر' کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔ یہ قبیلہ جزیرہ نمائے عرب میں اِسی نسبت سے غامدی کہلاتا ہے۔ خیال ہوا کہ یہی کام تو میرے دادا کرتے تھے۔ اِس کے لیے یہ نئی تعبیر علم میں آئی تو بے حد مسرت ہوئی۔ والد سے ذکر ہوا تو اُنھوں نے بھی پسند کیا۔ چنانچہ اُسی دن فیصلہ کر لیا کہ یہ لفظ ''غامدی'' اب میرے نام کا حصہ بن جائے گا۔ ساہیوال کے دیہاتی ماحول میں اِس طرح کا نام مذاق بن جاتا، اِس لیے اِسے بہت بعد میں لکھنا شروع کیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۷۲ء میں بی اے کیا۔ ابتدا میں ادب اور فلسفہ میں دل چسپی تھی۔ پھر جماعت اسلامی میں شامل ہوئے۔ مولانا مودودی کے ساتھ قریبی تعلق قائم ہوا، مگر جب امام امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعارف ہوا تو اصلاً دل چسپی قرآن مجید اور فراہی مکتب فکر کے ساتھ ہو گئی۔ یوں مذہب کی سیاسی تعبیر کے ساتھ تعلق قصۂ ماضی بن گیا۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء تک سول سروسز اکیڈمی میں تدریس کی۔ ۲۸/ جنوری ۲۰۰۶ء سے

اسلامی نظریاتی کونسل کے دو سال کے لیے رکن بنے، مگر ستمبر ۲۰۰۶ء میں کونسل سے اس لیے استعفیٰ دے دیا کہ حکومت نے مذہبی جماعتوں کے سیاسی اتحاد، ایم ایم اے کے دباؤ میں آکر علما کی ایک ایسی کمیٹی قائم کر دی جس کا کام کونسل کے مجوزہ حقوق نسواں بل پر نظر ثانی کرنا تھا۔ غامدی صاحب نے اسے کونسل کے دائرۂ اختیار میں مداخلت قرار دیا اور کونسل کے مجوزہ حقوق نسواں بل میں علما کمیٹی کی ترمیمات کو اسلامی قانون کے منافی قرار دیا۔

غامدی صاحب کی کتب میں ''البیان'' تفسیر قرآن ہے، ''میزان'' اسلام کی شرح ووضاحت پر مبنی ہے، ''الاسلام''، ''میزان'' کی عام فہم تلخیص ہے، ''برہان'' معاصر مذہبی فکر پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اور ''مقامات'' ان کے سفر حیات کے واقعات اور احساسات کا بیان۔ ان کے علاوہ ''خیال وخامہ'' ان کی شاعری کا مجموعہ ہے۔

اردو ماہنامہ ''اشراق' اور انگریزی ماہنامہ ''رینی ساں'' کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ ادارۂ علم و تحقیق، المورد کے بانی صدر ہیں۔

دیگر تلامذہ، پاکستان

محمود احمد لودھی۔ عبداللہ غلام احمد، ماجد خاور، سعید احمد، سلیم کیانی، صاحب زادہ ابرار احمد بگوی شامل تھے۔ ماجد خاور صاحب تفسیر ''تدبر قرآن'' اور امین احسن کی دیگر کتب کے پبلشر بھی ہیں۔

داؤد احمد صاحب نے امین احسن کے دروس اور گفتگوؤں کی ریکارڈنگ کے معاملات سنبھال رکھے تھے۔

بھارت

مولانا مرحوم کے تلامذہ میں مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی، مولانا عزیز الرحمٰن اصلاحی، مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا اظہار الدین اصلاحی، مولانا بدر الدین اصلاحی، مولانا صدر الدین اصلاحی، حکیم فیاض احمد اصلاحی، مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی اور ڈاکٹر عبد اللطیف اعظمی قابل ذکر ہیں (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۲)۔

[باقی]

Monthly
ISHRAQ
Lahore

July 2025
Vol.37 No.7
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق